NOVEMBER
2023

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

جناب اشفاق ناصر کے شعری مجموعہ کی تقریبِ رونمائی میں جناب خالد مسعود، جناب عباس تابش، جناب شکیل جاذب

جناب ریاض حسین زیدی، جناب ریاض مجید سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

جناب ڈاکٹر فخر عباس، جناب ریاض حسین زیدی، محترمہ سیدہ آمنہ ریاض

جناب ریاض حسین زیدی اپنے احباب کے ساتھ

غزل

پار اُتریں گے فقط پار اُترنے والے
کس نے جانا تھا کہ مر جائیں گے مرنے والے

لفظ ترتیب نہ دے ، درد کوئی لفظ نہیں
اور بکھریں گے بکھر کر نہ بکھرنے والے

زہر بن کر نہ رگ و پے میں اُتر جائیں کہیں
سانس بن کر مری سانسوں میں اُترنے والے

جس طرح تیغیں نیاموں سے سفر کرتی ہیں
یوں گزر جائیں گے دنیا سے گزرنے والے

بے نوا لوگ پکڑ لیں گے خدا کی لاٹھی
قرض پھر قرض ہے بھر جائیں گے بھرنے والے

موت کے گھاٹ اُتر جائیں گے دریا خالد
ریت ہو جائیں گے صحراؤں سے ڈرنے والے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-6
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 31 - نومبر 2023 - شمارہ نمبر: 11

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاوید احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: سید ریاض حسین زیدی
جناب اشفاق ناصر کے شعری مجموعے کی تقریب رونمائی

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

www.trackntie.com
BAYAZ
ویب سائٹ برائے مطالعہ

نعمان منظور نے جدید پرنٹرز اور پیپر سے ٹریک اینڈ ٹائی پلازہ 16 کلومیٹر زد رحمان پلازہ سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّاَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سرور حسین نقشبندی	7
2	نعت	جلیل عالی، نسیم سحر، خاور اعجاز، محمد یٰسین قمر، سرور حسین نقشبندی، فیض رسول فیضان، نبیل احمد نبیل، نعیم رضا بھٹی	8 تا 15
3	عقیدت	خالد علیم، مظہر عارفی	16 تا 18
4	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	19 تا 22
5	گوشہ سید ریاض حسین زیدی	حمد، نعت، غزل	23 تا 27
		نظم (احمد جلیل)	28
		سید ریاض حسین زیدی پر اہلِ فن کی مختصر آرا: امین راحت چغتائی، سلیم اختر، ریاض مجید، خورشید رضوی، خورشید بیگ میلسوی، سعود عثمانی، واجد امیر، جمیل احمد عدیل	29 تا 31
		مضامین: سید جعفر شیرازی، حسن عسکری کاظمی، خالد علیم، علی رضا، رحمت علی شاد، واصف سجاد، افتخار شوکت، ریاض احمد قادری	32 تا 51
6	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	52 تا 60
7	افسانے	فیروز بخت قاضی، نیلما ناہید درانی، کلیم خارجی، شہزاد تصور، اقبال خان یوسف زئی، حماد ریاض، واجد علی، محمد افتخار شفیع، طوبیٰ صدیقی	61 تا 101

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	خالد احمد، توصیف تبسم، مرتضیٰ برلاس، آصف ثاقب، جلیل عالی اعجاز کنور راجہ، یعقوب پرواز، خاور اعجاز، نسیم سحر، گلزار بخاری خالد علیم، مسعود احمد، سعد اللہ شاہ، محمد انیس انصاری، اقبال سروبہ راحت سرحدی، طالب انصاری، شفیق احمد خان، احمد جلیل اسلام عظمی، سید عارف امام، افتخار شاہد، ہمایوں پرویز شاہد عقیل رحمانی، توقیر عباس، انصر حسن، رانا غلام محی الدین اظہر عباس، فخر عباس، ظہور چوہان، ریاض ندیم نیازی، رخشندہ نوید عاصم بخاری، قیوم طاہر، شوکت محمود شوکت، خالدہ انور سعدیہ بشیر، اعجاز روشن، اویس الحسن، شہاب الدین شہاب افتخار شوکت، فیض رسول فیضان، بشیر احمد حبیب، خالد ندیم شانی احمد سجاد بابر، یاسر رضا آصف، مستحسن جامی، وسیم جبران، شبہ طراز اکرم جاذب، علمدار حسین، اجمل اعجاز، افروز رضوی، طاہر یٰسین طاہر محمد اشرف کمال، رضا اللہ حیدر، محمد اشفاق بیگ، نعمان محمود افضل ہزاروی، کوکی گل، امجد بابر، روا حاصل خلوص ازور شیرازی، زاہد خان، حکیم خان حکیم، زبیر خیالی اکرم الحق سرشار، محمود کیفی، ساگر حضور پوری، اظہر کمال ریاض ہمدم، احمد محسود، عنبرین خان، خالق آرزو محمد نور آسی، نادیہ سحر، امتیاز انجم، جاوید عباس، آمنہ روشنی رشا	102 تا 180
9	مضامین	حامد یزدانی، ظفر معین بلے جعفری، حامد سعید اختر نبیل احمد نبیل، فیصل زمان چشتی، راحیلہ خورشید	181 تا 212
10	نظمیں	خالد احمد، توصیف تبسم، جلیل عالی، خاور اعجاز، شاہین عباس محمد افتخار شفیع، اسلام عظمی، اکرم ناصر، اکرم سحر فارانی، امجد بابر، رخشندہ نوید عاصم بخاری، صغیر احمد صغیر، نائیلہ راٹھور، فرخندہ شمیم، زعیم رشید خالد ندیم شانی، زاہد خان، فرح شاہد، احسان فیصل کنجاہی، مہر علی سیمحسن، ضیا المظہری، محمد امین کنجاہی، نصرت نسیم، اسامہ احمد	213 تا 241

حمد

جو بولتا ہوں اسے تولنا نہیں آتا
میرے کریم مجھے بولنا نہیں آتا

میرے وجود کی اپنی گرہ نہیں کھلتی
کوئی بھی عقدہ مجھے کھولنا نہیں آتا

نہ گفتگو میں ہے تاثیر کا ہنر معلوم
تبھی تو بات میں رس گھولنا نہیں آتا

عروس حرف کی زیبائی دسترس میں نہیں
کسی خیال کا در کھولنا نہیں آتا

میں تیرے نام کی تسبیح کرنے والا ہوں
اسی لیے تو مجھے ڈولنا نہیں آتا

تیری نگاہ کا طالب ہے نطق سرور کا
میرے کریم مجھے بولنا نہیں آتا

سرور حسین نقشبندی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ چھپایا نہ ہم نے دُنیا سے
عشق ہم نے کیا بھرے بازار

نعتؐ

ہر سانس کی پکار یہی مدّعائے دل
جو رہ رضا حضورؐ کی اُس راہ جائے دل

پیہم لہو میں موجِ مودّت رواں رہے
بہتی رہے بُوئے حرم آبنائے دل

مہکے شمیمِ یادِ خدا سے ریاضِ جاں
روشن ہو نورِ عشقِ نبی سے سرائے دل

جاگیں نہ عکس آنکھ میں جو اُس جمال کے
انساں وبالِ دہر سے کیسے بچائے دل

احساس جب سرشکِ ندامت میں ڈوب جائے
ایسے میں بس امیدِ شفاعت بڑھائے دل

اُس رحمتِ زماں کی ولا سے جو فیض پائے
سینے میں ایک اور ہی دنیا بسائے دل

اک یاد جس سے شاد رہے صبح و شام جی
اک اسم جس سے دور ہو ہر اک بلائے دل

ہم لوگ لشکری شہِؐ بدر و حنین کے
ممکن نہیں کہ پیشِ عدو ڈگمگائے دل

درد اپنے اپنے اُس درِ رحمت پہ لے چلیں
عالی اسی مطب سے ملے گی دوائے دل

جلیل عالی

نعت

آقا حضورؐ کا جو ثناء خوان ہو گیا
وہ شاملِ قبیلۂ حسان ہو گیا

کر پایا جو بھی پیروی سیرتِ رسولؐ
گویا نئے سِرے سے مسلمان ہو گیا

ابجد کے سب حروف ردیفوں میں ڈھل گئے
صد شکر، میرا نعتیہ دیوان ہو گیا !

زادِ سفر میں عشقِ نبیؐ لے کے جب چلا
میرا سفر کٹھن تھا جو آسان ہو گیا

یوں میرے دل میں اُس کی ہوئی ہے بڑھوتری
عشقِ رسولؐ جو گُل تھا، گلستان ہو گیا

اللہ کے حبیبؐ کی مِدحت کے وِرد سے
بے شک مری نجات کا سامان ہو گیا

لا رَیب اُسے بشارتِ جنّت ملی نسیم
جو حُرمتِ رسولؐ پہ قربان ہو گیا

نسیمِ سحر

نعتؐ

محبتوں کا شجر سایہ دار آپؐ سے ہے
خزاں رُتوں میں اُمیدِ بہار آپؐ سے ہے

جہانِ فکر کھُلا آپؐ کے وسیلے سے
ہماری سوچ کا سارا نکھار آپؐ سے ہے

یہ کائنات کبھی کی بکھر گئی ہوتی
نظامِ کون و مکاں سازگار آپؐ سے ہے

یہ صرف عرصۂ موجود کا شرف ہی نہیں
ازل ابد کا ہر اِک افتخار آپؐ سے ہے

فلک نشینوں میں بھی سر بلند ہیں ہم لوگ
کلاہِ صبر و یقیں با وقار آپؐ سے ہے

یہ دل یہ راہِ طلب کا مسافرِ تنہا
بس اِک نگاہ کا اُمیدوار آپؐ سے ہے

مَیں ایک ذرّہ ہُوں صحرائے زندگانی کا
مِرے وجود کا ہر اعتبار آپؐ سے ہے

خاور اعجاز

نعتؐ

سجائے آنکھوں میں جذبات کو دعا انداز
دیارِ نور میں آتے ہیں سب ثنا انداز

وہ جن کو ملتی ہے خیرات آپؐ کے در سے
رویّے ان کے ہوا کرتے ہیں سخا انداز

وہ جن کی طبع میں رس جائے آپؐ کی سیرت
مزاج و خلق میں ہوجائیں وہ صبا انداز

ہو جن کا راہنما نقشِ پائے ختمِ رسلؐ
جہان کے لیے ان کے ہیں رہنما انداز

شرف اسے بھی میسر ہو میزبانی کا
ہو مشکبار مرا دل کبھی حرا انداز

خدا کا شکر ہے وابستگی مری اُنؐ سے
ہیں جن کے لطف وعنایت کے بے بہا انداز

تکلّفات سے ہو جاؤں میں بری یارب
عطائے خاص سے مل جائے بے ریا انداز

حیاتِ احمدؐ مرسل ہو مرکز و محور
ترا قمر مرے مولا ہو جب نوا انداز

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

ہر اک طلب ہر اک دعا قبول ہی قبول ہے
یہاں جو لب پہ آ گیا قبول ہی قبول ہے

جو بات لب پہ آ گئی حضور حق ہے مستجاب
حضور نے جو کہہ دیا قبول ہی قبول ہے

در شہ امم پہ آ کے جو طلب ہو مانگیے
یہاں ہر ایک مدعا قبول ہی قبول ہے

خدا کے ہاں سے ہو گئیں معافیاں تلافیاں
یہاں جو چل کے آ گیا قبول ہی قبول ہے

حدود شہر نور میں جب آ گئے تو بالیقیں
وہ نیند ہو کہ رتجگا قبول ہی قبول ہے

یہ شرط ہے ریا کا اس میں شائبہ ذرا نہ ہو
جو ان کے نام پر دیا قبول ہی قبول ہے

خلوص دل سے کی گئی اگر ہو سرور حزیں
ثنائے شاہ دوسرا قبول ہی قبول ہے

سرور حسین نقشبندی

نعت

کیا بیاں ہو سرورِ کونین کی توقیر کا
رکھتے ہیں دارین درجہ آپ کی جاگیر کا

تھا براہیمیؑ دعا میں بھی مرے آقا کا ذکر
مرحلہ درپیش تھا کعبے کی جب تعمیر کا

اسمِ احمدؐ کے مسمّٰی کی ولادت ہو گئی
لمحہ آیا خوابِ عیسیٰؑ کی حسیں تعبیر کا

لامکاں تک سلسلہ پھیلا ہوا ہے بالیقیں
مہرِ فاران و حرا کی تابش و تنویر کا

کارفرما ہو جدھر محبوبِ داور کی خوشی
پھیر دیتی ہے مشیّت رُخ اُدھر تقدیر کا

کون سمجھے منزلت اُس سیدِ سادات کی
جس کا گھر مصداق ٹھہرے آیۂ تطہیر کا

عاشقوں کو ہر عبادت اور ہر نیکی لگے
عکس و مظہر عظمتِ سرکار کی تشہیر کا

بحرِ رحمت آپ کا آیا کچھ ایسے جوش میں
مٹ گیا نام و نشاں میری ہر اک تقصیر کا

بے نوائی کو پذیرائی عطا کرتے ہیں وہ
راز ہے یہ بے نوا کے شعر کی تاثیر کا

کرتا ہے فیضانؔ افزوں جذبۂ دیدار کو
حُسنِ اقدس روضۂ محبوب کی تصویر کا

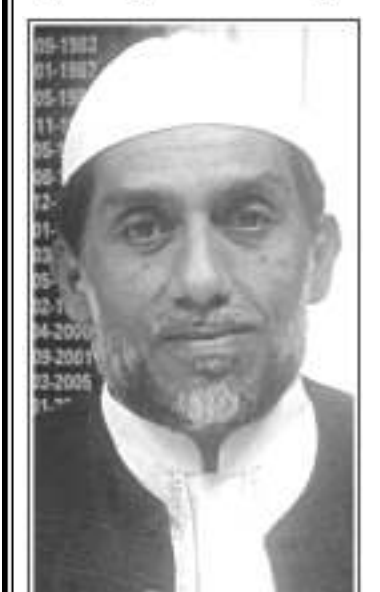

فیض رسول فیضان

نعتؐ

جب تصور میں مدینے کا سفر دیکھتا ہوں
اپنی کیفیتِ ایماں کا اثر دیکھتا وہں

سوچتا ہوں تو پہنچ جاتا ہوں اُنؐ کے دَر تک
اپنی پلکوں کو جُھکا کر وہ نگر دیکھتا ہوں

کیسے بچھتی تھی زمیں آپؐ کے نعلین تلے
کیسے جُھکتے تھے سرِ راہ، شجر دیکھتا ہوں

اُم معبد کا وہ خیمہ ہُوا روشن اُنؐ سے
نُور افشانیِ ہجرت کا سفر دیکھتا ہوں

تیرہ و تار دِلوں پر بھی ضیا پاش ہوئی
نکل آئی تھی جو فاراں پہ سحر دیکھتا ہوں

کون پوچھے گا قیامت میں سوائے اُنؐ کے
حشر میں بھی کَرَمِ خیرِ بشر دیکھتا ہوں

کون کرسکتا ہے میرے غمِ دل کا درماں
میں تو بس اُنؐ کی طرف شام و سحر دیکھتا ہوں

جب بھی اُنؐ کے کَرَم و لُطف میں آتا ہوں نبیل
اُنؐ کا گھر دیکھتا ہوں، جُنبشِ در دیکھتا ہوں

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

حضورؐ آپ نے مجھ کو اُجال رکھا ہے،
وگرنہ کون سا مجھ میں کمال رکھا ہے

حضور آپ کے دم سے ہیں سب جہاں آباد،
مجھے بھی آپ کی نسبت نے پال رکھا ہے

حضور آپ ہی یکتا دکھائی دیتے ہیں،
خدا نے آپ میں اتنا جمال رکھا ہے

حضور قولِ مطہر ہیں ہم قدم میرے،
اُنہی کو نعت کے سانچے میں ڈھال رکھا ہے

حضور ذات کے اندر مرے عدو نے مجھے،
کچھ ایسے جیسے ہوا میں اُچھال رکھا ہے

حضور مجھ میں ندامت کا کوئی وصف نہیں،
اگرچہ میں نے سخن برشگال رکھا ہے

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ ریگِ پا نہیں تھی، ستاروں کا چھان تھا
قرآن پر گواہ تھا اُن کا چلن تمام

رباعیات (حمدیہ)

تو عالمِ بے حصار، میں ایک سراب
تو قلزمِ بے کنار، میں ایک حباب
ہیں تیرے طلوع سے ازل اور ابد
ہے میرے غروب سے زمانوں کا حجاب

.....

ہر ایک گلِ شگفتہ غماز ترا
غنچے کی چٹک میں نغمۂ ساز ترا
وَاللّیلِ اِذَا سَجٰی ادا ہے تیری
والصّبحِ اِذَا تَنَفَّسْ انداز ترا

.....

عالم میں تمام دل کشائی ہے تری
ہر سمت محیط کبریائی ہے تری
جو دیکھ رہا ہوں، وہ تری حکمت ہے
جو دیکھ نہ پاؤں، وہ خدائی ہے تری

.....

رخشندہ چراغِ انجمن تو نے کیا
صحرا کو ہم سرِ چمن تو نے کیا
پانی کو کیا ہے تو نے آئینہ صفت
پتھر کو گوہرِ عدن تو نے کیا

.....

پھولوں میں مہک بن کے اترتا ہے تُو
ہر غنچہ و گل میں رنگ بھرتا ہے تُو
ہر روز سمیٹ کر ردائے اسود
ہر صبح کرن کرن بکھرتا ہے تُو

اندھوں کو بصارتیں عطا کرتا ہے
بہروں کو سماعتیں عطا کرتا ہے
دیتا ہے قوتیں تو معذوروں کو
نادانوں کو حکمتیں عطا کرتا ہے

.....

سورج کو پئے غروب لے جاتا ہے
چادر تاریکیوں کی پھیلاتا ہے
بکھرا کے سحر کا نور گلشن گلشن
ہر پیکرِ گل میں جان دوڑاتا ہے

.....

محروم کو دولتِ کرم دیتا ہے
محکوم کو قوت و حشم دیتا ہے
دینے جو لگے تو ایک قطرے کے عوض
تو بحر بہ بحر، یم بہ یم دیتا ہے

خالد علیم

رُباعیات مناقبِ حضرت حفصہ بنتِ عمر رضی اللہ عنہا

کب نہر ہے مجھ کو سرِ دریا لکھنی
کب دھول ہے مجھ کو پسِ صحرا لکھنی
یارب! مجھے دے لفظ و معانی کا فرات
ہے منقبتِ حضرتِ حفصہ لکھنی

.....

ہجرت کا تھا وہ تیسرا سالِ انور
یہ بن کے دلہن آئیں نبی کے گھر پر
منظرؔ! تھی فقط ساٹھ برس عمر اِن کی
جب دنیا سے حفصہ گئیں رخصت ہو کر

.....

تو حمد و ثنا لکھ چکا اوّل ، اوّل
تو لکھنے سے عاجز نہ ہوا نظم و غزل
اے میرے قلم! رب تری عزّت رکھے
اب منقبتِ حضرتِ حفصہ میں بھی چل

.....

دو بار ہوئے حضرتِ حفصہ کے نکاح
دونوں ہی تھے واللہ! شرف والے نکاح
بہتر سے ہوا اِن سے ، نکاحِ عثماں
اِن سے کیا عثمان سے بہتر نے نکاح

.....

مالک کی قسم ، بنتِ عمر ہیں حفصہ
اِک فردِ اَہم ، بنتِ عمر ہیں حفصہ
ملحوظ رہے آخری سانسوں تک ادب
اے مرے قلم ! بنتِ عمر ہیں حفصہ

.....

غزووں میں، سفر میں رہیں، یا گھر میں رہیں
تا عمر حیات آفریں منظر میں رہیں
یہ بنتِ عمر ، حضرتِ حفصہ منظرؔ!
کُل آٹھ برس عقدِ پیمبر میں رہیں

.....

قرشی ہیں، فزوں رُتبہ ہے اِن کا مکتب
محبوبِ خدا سے ہے جُڑا اِن کا نسب
بابا کا ہے نام اِن کے عمر بن خطاب
اور والدہ کا اسمِ گرامی زینب

.....

لافانی مسرت کی خوشی میں ہوں گی
وارفتہ نعمّاتِ غنی میں ہوں گی
جنت میں خدا حفصہ کو دے گا یہ شرف
جنت میں بھی یہ عقدِ نبی میں ہوں گی

.....

کیسے ہو بیاں اِن کی عبادت کا خشوع
کیا لکھے کوئی حفصہ کی پروازِ خضوع
اِک بار طلاق ایک، انہیں آقا نے دی
پھر حکمِ خدا پا کے کیا اِن سے رجوع

.....

اللہ کو تھی خاص محبت اِن سے
رکھتے تھے رسول اللہ بھی رغبت اِن سے
ہیں حضرتِ حفصہ کی ثقاہت پہ دلیل
جتنی بھی حدیثیں ہیں روایت اِن سے

.....

ایماں ہے اگر جان، تو جاں ہیں حفصہ
ذی شانیِ اسلام کی شاں ہیں حفصہ
اِک زوجِ نبی ہونے کے باعث منظرؔ!
اُمّت کے ہر اِک فرد کی ماں ہیں حفصہ

.....

معراج ہیں معراج ، وفا کی حفصہ
سر تاج ہیں سرتاج ولا کی حفصہ
آ ! پیش کریں حضرتِ حفصہ کو سلام
بیوی ہیں رسولِ دو سَرا کی حفصہ

.....

تقدیر میں لکھی نہ ہو گر پامالی
دل ہو نہ اگر حُبِّ و وفا سے خالی
سُن حشر تلک رب کے پیمبر سے سُن
حفصہ کے مراتب کی بلند اقبالی

اے دانشِ نو ! جان اِسی کو منزل
ایماں اِسی صورت سے رہے گا کامل
ہر زوجۂ محبوبِ خدا کی صورت
خالی نہ ہو حفصہ کی وِلا سے بھی دل

.....

دل میں ہمہ دم چاہ رہے حفصہ کی
لب پر لبِ دم ، آہ رہے حفصہ کی
ہر اُمتیِ سرورِ عالم منظرؔ!
سیرت سے بھی آگاہ رہے حفصہ کی

.....

مریم کے کمالات و خصائل سے گریز
حورانِ بہشتی کے شمائل سے گریز
منہ پھیرنا اللہ کے محبوب سے ہے
حفصہ کے بھی اوصاف وفضائل سے گریز

.....

اِس میں مِرا ہم فکر ہے میرا وجداں
کچھ اِس میں ملامت کا نہیں مجھ کو گماں
منظرؔ! مجھے یہ کہنے سے روکے گا کون
حفصہ سے محبت کا بھی ہے نام، ایماں

☆☆☆☆☆

منظر عارفی

بھرم

احباب آپ سے ڈرتے ہوئے اور ناراضگی کے خوف سے محبت کریں تو یہ بھرم رکھنے والی بات ہے چلیے دلی محبت نہ سہی بھرم ضرور قائم رکھنا چاہیے جو اصلی تو نہیں مگر اک ہلکی سی پہچان بہرحال ہے- سچا عشق اس سے بہت آگے کی کیفیت ہے جس میں زندگی کسی ایک کے نام لگا دی جاتی ہے جو تمام محبتوں کا حرفِ آغاز بھی ہے اور آخری مقام بھی- حضرت بابا جی بلھےؒ شاہ اسی ضمن میں فرماتے ہیں:

بلھاؒ شاہ بدلیسوں آوندا
ہتھ کنگا تے باہیں لٹکاوندا
سر صدقہ تیرے ناوندا

یعنی یہ صرف کسی ذاتی منفعت کے لئے نہیں کہ دوست ناراض ہوگیا تو نقصان ہوگا بلکہ بلھے شاہ جی فرماتے ہیں مجھے ساجن کی محبت کا ایسا روگ ایسا جوگ ایسا سنجوگ اور پیار ملے کہ میں محبوب حقیقی بنا زندہ ہی نہ رہوں محبوب پردیسیوں آرہا ہے (یعنی اُخروی زندگی اور برزخی جہاں سے آرہا ہے ساتھ رحمت کے خزانے اور درگذر کے کنگن لارہا ہے)

بندہ بھی عجیب ہے- اعلانیہ گناہ کرنے والا تو مالک کا یہ سادہ سا بھرم بھی توڑ ڈالتا ہے ایسا بندہ پریم کا سفر کیسے کرے گا جس نے مالک کو ہی ناراض کرلیا مالک روٹھ گیا تو سمجھیں سب کچھ روٹھ گیا کچھ بھی باقی نہیں بچا جسے سنبھال کر رکھیں- ایک شاعر دوست کہتے ہیں:

کچھ بھی نہیں بچا جسے رکھیں سنبھال کر
ہم نے یہ فیصلہ کیا سکہّ اُچھال کر

ولولہ جوش جذبہ تڑپ وارفتگی مستقل مزاجی جدوجہد کوشش بعض اوقات بظاہر منزل پر نہ پہنچا سکیں تو بھی وہ بھرم قائم رکھتے ہیں دیکھنے والے کہتے ہیں- زندگی کی دوڑ میں تگ ودو میں یہ شخص اچھا کھیل کر ہار گیا- جو کھلاڑی اچھا کھیل کر ہار جائے اس پر افسوس نہیں ہوتا- کوشش بہرحال ضروری ہے میرا روم میٹ کہا کرتا تھا:

''طالب علم پڑھ کر بھی فیل ہوسکتا ہے مگر بغیر پڑھے پاس نہیں ہوسکتا''

چلتے رہنا ہی نام وری تک لے جاتا ہے- چلنا موقوف کردیں تو زندگی ایک لاحاصل سعی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگی اک مسلسل کوشش سے یہی بھرم نشوونما پاتا ہے تڑپ عطا کرتا ہے مالک اس بھرم کو قائم رکھتے ہیں دنیا والوں کو پتہ ہی نہیں چلنے دیتے کہ خالقِ ارض وسما کا یہ بندہ اندر سے کیا تھا وہ کمال مہربانی سے اس کا باہر ہی قبول کر لیتے ہیں اسے اس لئے ردّ نہیں کرتے کہ بندہ کہیں محبت کی راہوں میں لڑکھڑا نا جائے کہیں اس کا یقینِ کامل شکوک وشباہت کی نذر نہ ہو جائے کہ تشکیک مومن کے دل میں نقب زنی کے لئے ہر دم تیار رہتی ہے- مالک کو بندے پر

سلیمان عبداللہ ڈار

رحم بھی آتا ہے اور پیار بھی کہ اس کے ایمان بالغیب کا نرخ نامہ بہت بلند ہونا چاہیے ایمان کی ارزانی مالک کو پسند نہیں مومن جب بھی لڑکھڑائے محبوب حقیقی کی رحمت اسے تھام لیتی ہے دنیاوی محبوب تو عموماً راہ میں گرتے پڑتے محب کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے دنیاوی محبوب اوروں کے لیے رحم دل مگر چاہنے والے کے لئے ستم گر ہوتا ہے جبکہ محبوب حقیقی کے پاس محب کے لئے رحمتیں ہی رحمتیں ہیں یہاں تو ناراضگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ سا جن کسی سے بھی روٹھنا نہیں چاہتا یہ تو طلبین کو بھی نوازتا ہے۔ ٹھوکریں کھانے والوں کا سب سے بڑا سہارا۔ غم خوار بھی غم گسار بھی ہم درد بھی ہم راز بھی حتیٰ کہ سب کچھ یہی ہے دنیاوی محبوب سے بڑی شدید محبت کرنے والا بھی ڈرتا رہتا یہ سوچ کر کہ ہم تو چاہنے والے ہیں کسی بات کا وہ بُرا نہ منائے سو بار سوچا پھر اک بات کی کہ ہو سکتا ہے میری کوئی بات طبع نازک پر گراں نہ گزرے انتہائی منت سماجت بھی بعض اوقات بار آور ثابت نہیں ہوتی عمر بھر کا رونا بے کار جاتا ہے۔ دل کی گہرائیوں سے پیار کرنے والوں کا بھی محاسبہ ہوتا ہے مگر محبوب حقیقی کے قربان جایئے وہ بھرم رکھتا ہے۔ علمائے کرام بتاتے ہیں کہ حشر کے روز بعض بلکہ بہت سے چاہنے والوں کو حساب کتاب کے بغیر ہی وہ جنت عطا کر دے گا کس لیے؟ اس لئے کہ ان بندوں سے خطا تو ہو گئی مگر انھوں نے دل سے توبہ کی اللہ نے ایسی پردہ پوشی کی کہ لوگ انھیں نیکو کار سمجھتے رہے تو مہربان مولیٰ نے ایسا انتظام کر دیا حشر کے روز بھی لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ یہ تو ایسے لوگ تھے جن سے کوتاہیاں سرزد ہوئیں۔

دنیاوی محبتوں میں ہی بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔ آپا بانو قدسیہ رحلت فرما گئیں چند سال قبل ٹی وی کے ایک پروگرام میں جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کے نابغہ روزگار شوہر اشفاق صاحب (مرحوم) کیسے تھے تو انھوں نے بتایا:

''وہ بڑی محبت کرنے والے تھے گھر میں ابن انشاء قدرت اللہ شہاب اور کئی دوسرے احباب آتے مگر اشفاق صاحب بڑی غیرت والے تھے۔ بڑے ہی فرینک دوستوں کے ساتھ بھی انھوں نے پردہ رکھا۔ میرے اور ان کے دوستوں کے درمیان وہ اک ریشمی پردہ تھے۔ بہت پریشان حال ہوتے تو بھی بیٹے کو مجھے یا گھر والوں کو اس کی خبر ہی نہ ہوا کرتی انھوں نے میرا ایسا بھرم رکھا کہ وہ میری چادر بھی تھے چار دیواری بھی تھے میں چیک کاٹنا نہیں جانتی وہ بل جمع کروانے جاتے گھر کے کام کاج کے لئے دفاتر میں خود جاتے۔

سوال کیا گیا ''بانو آپا کیا آپ کی شادی محبت کی شادی تھی تو بانو آپا نے کہا'' اشفاق صاحب کی تو محبت کی شادی تھی مگر میری نہیں تھی کہ میں اک گری پڑی چیز تھی ان کی وجہ سے میری شناخت ہو گئی'' جس بھرم رکھنے والی سوچ کا بانو آپا نے ذکر کیا آ کر وہ ہمارے ہاں کتنے لوگوں میں کتنے جوڑوں میں کتنے گھروں میں موجود ہوتی ہے۔

غلط کار کو بھرم رکھنے والا مل جائے تو اس کے نیکوکار بننے کے قوی امکانات ہوتے ہیں یہاں ڈھانپنے والے تھوڑے ہیں نشتر کرنے والے زیادہ ہیں ڈھارس بندھانے والے تھوڑے ہیں دلبرداشتہ کرنے والے زیادہ ہیں عزت دینے والے تھوڑے بدلحاظ زیادہ ہیں محبت کرنے والے تھوڑے نفرت کرنے والے زیادہ ہیں سراہنے والے تھوڑے تنقید کرنے والے زیادہ ہیں ایمان اور یقین تھوڑا منافقت زیادہ ہے جھکتا ہوا تولنے والے تھوڑے ڈنڈی مارنے والے زیادہ ہیں کپڑے پہنانے والے تھوڑے اتارنے والے زیادہ ہیں تعریف کرنے والے تھوڑے سرزنش کرنے والے زیادہ ہیں رہبری کرنے والے تھوڑے رہزنی کرنے والے زیادہ ہیں بلکہ ہمارے ہمارے معاشرے میں تو راہبر ہی راہزن ہیں تنقید کرنے والا بھرم کو تار تار کر دیتا ہے لوگوں سے احباب سے جینے کا ہنر چھین لیتا ہے جرم سے زیادہ سزا دیتا ہے یہ تار تار دامن بے کلی پیدا کرتا ہے دوسروں کو ڈھانپنے والا احباب پر ناداروں پر سائبان کی طرح تن جاتا ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ حق پر پردہ ڈال رہا ہوں وہ اس کا استحقاق رکھتے بھی ہیں یا نہیں -بادل تو سب کو چھاؤں دیتا ہے سب پر برستا ہے اب یہ اپنا اپنا ظرف ہے بادل گلستان پر برسے تو کلیاں پھول بنتی ہیں خوشبو پھیلاتی ہیں کہ جسے چمن کے اردگرد دیواریں قید نہیں کر سکتیں یہی بادل فلتھ ڈپو پر برسے تو تعفن مزید بڑھتا ہے۔

اللہ والوں نے عارفانہ کلام میں اللہ سے دل کی بات کی ہے۔ حضرت شاہ حسین کی کافیاں ہوں یا بابا جی بلھے شاہ کا کلام ہو حضرت بابا جی غلام فرید کی کافی ہو یا بابا جی فرید گنج شکر کے اشلوک ہوں۔ دل کی بات مالک سے عورت یا لڑکی کی زبان ہی میں کی جاتی ہے، ہو سکتا ہے اللہ والوں نے یہ سوچا ہو کہ نازک خیالی صنفِ نازک کی زبان سے بڑی خوبی کے ساتھ ادا ہو سکتی ہے۔

حضرت بابا جی بلھے شاہ فرماتے ہیں:

جے مائے تینوں کھیڑے پیارے
ڈولی پا دیویں ہور نی مائے
ساڈھے ول کھلوا موڑ وے پیاریا

.....

اللہ جل شانہ خالق ہیں تخلیق کرتے ہیں ماں بھی اللہ کے حکم سے بچے کی تخلیق کرتی اس طرح سے ماں بھی تھوڑی تھوڑی رب والی صفات کی حامل ہوتی ہے جو اللہ اسے اپنے خاص خزانوں سے عطا کرتے ہیں مثلاً:

☆-اللہ خطائیں معاف کرتے ہیں تو ماں بھی کوتاہیاں معاف کرتی ہے

☆-اللہ بندے کے عیب چھپاتا ہے اسی طرح ماں بھی کرتی ہے

☆-اللہ بندے سے نفرت نہیں کرتا ماں بھی اپنی اولاد سے نفرت نہیں کرتی

اسی لئے حضرت بابا جی بلھے شاہ زیرِ نظر اشعار میں فرما رہے ہیں ہیر ماں سے التجا کرتی ہے کہ اگر تمھیں کھیڑے اتنے ہی پیارے ہیں تو ڈولی میں کسی اور دلھن کو بٹھا دو -یعنی وہ کہنا چاہ رہی ہے کہ میری سچی محبت کا بھرم رہ جائے -یہ ایک استعارہ ہے یعنی اللہ والے اس کلام میں بین السطور یہ

فرمارہے ہیں کہ اے اللہ میری تجھ سے محبت سچی ہے اگر تجھے دنیاوی مسند عطا کرنا بھی ہے تو کسی اور کو دینا بس میری محبت کا کسی کو پتہ نہ چلے میرے سینے میں جو عشق الٰہی کی شمع فروزاں ہے اس کی جلتی لو کوئی اور نا دیکھ لے۔ اگر عاشق صادق یہ چاہے کہ اس دل میں جو قرب الٰہی کی التجا ہے اُس کا کسی کو پتہ نہ چلے تو۔

☆ اسے خلوت میں ذکر الٰہی کی عادت ڈالنا ہوگا۔

☆ اپنی دوسری دلی خواہشوں دنیاوی آرزوؤں اور محبتوں کو ترک کرنا ہوگی۔

☆ پردہ پوشی تب ہوگی جب ہم بھی لوگوں کی پردہ پوشی کریں گے ورنہ پردہ دری کریں گے تو سر سے سائبان اُتر بھی سکتا ہے۔

☆ اپنا ظرف وسیع کرنا ہوگا۔ تبھی سارے بھرم قائم رہ سکیں گے۔

☆ حسنِ خلق میرے اندر میں برپا پریشانیوں اور اکتاہٹوں پر ایسی ڈریسنگ کرے گا کہ اندر ہی اندر احباب کے خلاف ابلنے والا لاوا سرد ہو جائے گا۔

☆ خاموشی عظیم عبادت تو ہے ہی مگر یہ عالم کا زیور اور احمق کا بھرم ہے۔

☆ قناعت اگر نہ کریں گے تو اسراف سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دے گا۔

☆ اللہ کی یاد دلوں کا نور ہے یہ دل میں چھپے وسوسے کے آگے ڈھال بن کر کھڑی ہو جائے گی۔

☆ ہدایت طلب کرتے رہیں اس کا اک ذرہ بھی عطا ہو گیا تو اندر کا سارا کاٹھ کباڑ چھپ جائے گا۔

☆ اللہ کی طرف چلنے کا باطنی سفر ضرور اختیار کرنا یہ سارے عیب ڈھک دے گا۔

☆ بصارت گو بڑی نعمت ہے مگر بصیرت سے بڑی کوئی نعمت نہیں یہ دنیا کے سامنے (کوتاہیوں کے باوجود) آپ کو عریاں نہیں ہوتے دے گی۔

☆ ریاضت میں ہی راحت ہے۔ ریاضت کرنے والا پُرسکون ہوتا بھی ہے پر سکون نظر بھی آتا ہے۔

☆ جس نے عبرت پکڑلی وہ ناگہانی بدنامیوں سے بچ گیا۔

☆ باہر نا بھی بنا ہوا ہو تو دوسروں کو سراہتے جائیں احباب کی تعریف کریں دوستوں کی دلجوئی کریں اس سے اندر بنے گا جو بظاہر نظر تو نہیں آئے گا مگر اس کی مہک اردگرد ضرور پھیلے گی۔

☆ اہلِ دل ملتے رہیں یا ہم انہیں جا کر ملتے رہیں تو ان سے اک انوکھی دولت حاصل ہو گی محبت الفت۔ دوسروں کی اور اپنوں کی سرد مہری کو برداشت کرنے کا حوصلہ اس تعلق بنا ہوا نظر آئے گا دوستی قائم ہوتی ہوئی دکھائی دے گی چاہت کا بھرم نہ ٹوٹے تو یہ بات ہماری اپنی راحت کا سبب ہوگی۔

☆ اہلِ علم و فضل سے مصاحبت ہو گی تو برداشت کا مادہ پیدا ہوگا غصے پر قابو آئے گا جس سے عجلت پسندی کو مہمیز نہیں ملے گی اور لوگ ہمیں بردبار سمجھیں گے ورنہ دو سیکنڈ کا غصہ سارے بھرم بیچ چوراہے کھول کر رکھ دے گا۔

☆ خود کو ملامت کرتے رہیں نیکوں پر نازاں نہ ہوں دوستوں کا پردہ بن کر رہیں میں اگر استغفار کرتا رہوں گا تو اندر کی بدخصلتی کو یہ ندامت دھو ڈالے گی جس سے داغ دار دامن بھی اُجلا لگے گا۔

☆☆☆☆☆

حمد

ہے بے شک یہ سب کی یہ واحد صدا
بڑوں میں بھی سب سے بڑا ہے خدا

خدا نے یہ چاہا بنایا اسے
ہوئے مصطفیٰ ، نہ خدا سے جدا

کوئی جان پرور ہے بے جان ہے
یہ مرنا یہ جینا ہے اس کی رضا

وہ عرش بریں ہو یا زیر زمیں
نہیں حکم کن سے کوئی ماورا

ہے دست طلب بھی مراد آفریں
نہیں بے طلب اس سے کوئی ہوا

یہ پیار و محبت یہ انس و وفا
یہ اوصاف انساں ہے اس کی عطا

یہ تنگی یہ ترشی یہ غیظ و غضب
اسی کے کرم سے یہ ہوں گے فنا

خبردار اس کو بھلانا نہیں
یہ عصیاں ہے جس کی کڑی ہے سزا

مقدم ہے جس کو خدا کی رضا
خدا بھی ہے اس کی رضا پہ فدا

رسالت ہے توثیق توحید کی
ریاض رسالت سے مہکا ہوا

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

نبیؐ کا نام لیتا ہوں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں
جب ان کی یاد آتی ہے تو موتی اشک بنتے ہیں

صباحت آپؐ کے چہرے کی روشن مجھ کو کرتی ہے
ابھر کر چاند ایسے ذہن کے سانچے میں ڈھلتے ہیں

میں ہمدوشِ ثریا آپؐ کے قدموں میں ہوتا ہوں
ستارے رشک میں آ کر اشارے مجھ کو کرتے ہیں

میں آقاؐ آپؐ کی رحمت کا جب بھی ذکر کرتا ہوں
تو لمحے زندگی کے مسکرا کر مجھ سے ملتے ہیں

ہمارے ضعفِ ایماں سے سبکساری ہماری ہے
قدم اٹھتے نہیں اور پھبتیاں دشمن بھی کستے ہیں

صمیمِ قلب سے اپنے نبیؐ کو ٹوٹ کر چاہیں
اسی رستے پہ چل کر ہر قدم پر ہم سنبھلتے ہیں

مرے قلبِ حزیں میں آپؐ کی یادیں دھڑکتی ہیں
ستارے میری آنکھوں کے مری قسمت بدلتے ہیں

سلیقہ نعت کہنے کا عطا کر کے مجھے آقا!
کرم ایسا کیا غنچے ریاضِ دل میں کھلتے ہیں

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

مرے دل میں فوراً بڑھی روشنی
درود انؐ پہ میں نے پڑھا جس گھڑی

جو ہاتھ انؐ کے آیا وہ سب دے دیا
کوئی انؐ سے بڑھ کر نہیں ہے سخی

محمدؐ کے در سے ہی سب کچھ ملا
خدا بھی ملا ہے بفیضِ نبیؐ

جو اسوہ نبیؐ کا عمل میں رہا
جہانوں کی رحمت مقدر بنی

خیال و عمل میں جمود اب کہاں
کہ عشق و خرد میں رفاقت بڑھی

عجب سوز و مستی، عجب کیف و ذوق
مدینے کی آب و ہوا کیا لگی

ہوئی بے کسی ، بے بسی کالعدم
وہ بنتا گیا انؐ سے جس کی بنی

محبت ہے روح و روانِ حیات
اثاثہ ہے ایماں کا حبِ نبیؐ

جو حبِ نبیؐ سے ہوئی آگہی
نہیں آگہی اس سے بڑھ کے کوئی

ریاضِ نبیؐ دل میں ایسا کھلا
نہ ہرگز یہاں پھر خزاں کی چلی

سید ریاض حسین زیدی

غزل

گلے ملتے ہی کچھ گلہ نہیں تھا
یوں وہ پہلے کبھی ملا نہیں تھا

آنکھوں آنکھوں میں کیا اشارے تھے
کون سمجھے یہ حوصلہ نہیں تھا

اشہبِ شوق کی ترنگ نئی
قدم اس کا کہیں رکا نہیں تھا

درد مندی سے وہ رہا شاداں
زخمِ دل جو کبھی سلا نہیں تھا

کم نگاہی نے بیچ کر ڈالا
جو کبھی کم نظر ہوا نہیں تھا

کیسے افلاک پر پہنچ پاتے
پاؤں دھرتی پہ جب جما نہیں تھا

بڑے ناداں تھے رک گئے جو بھی
کارواں وقت کا رکا نہیں تھا

آنکھ شاداں ہے دیکھ کر ناخوب
دل کسی خوب پر لگا نہیں تھا

خود سلامی نے آ سلامی دی
جو کسی گام پر تھکا نہیں تھا

قصہ چھیڑا ریاض نے برحق
جو کسی اور نے کہا نہیں تھا

سید ریاض حسین زیدی

غزل

جو گر گئے ہیں، ان کو اٹھانے کی فکر کر
جو سو گئے ہیں ان کو جگانے کی فکر کر

ہر مضمحل کو حرفِ مسرت کی دے نوید
روٹھے ہوؤں کو دل سے منانے کی فکر کر

ہو گرمیِ نفس سے ہر اک مردنی بحال
گوشِ نیوش کو بھی سنانے کی فکر کر

مردہ دلوں کو روشنیِ ایثار سے ملے
خوں دے کے ایسی رسم نبھانے کی فکر کر

سدِ سکندری کی طرح ہم ڈٹے رہیں
رستہ جو روکے، اس کو ہٹانے کی فکر کر

آسیب ظلمتوں کے ڈراتے ہیں چار سو
شمعِ یقیں کو دل میں جلانے کی فکر کر

برقِ تپاں سے خیر کی امید کس کو ہے
جاں دے کے آشیاں کو بچانے کی فکر کر

عشق و جنوں کو جلوۂ رشکِ فلک بنا
سود و زیاں سے جان چھڑانے کی فکر کر

وارفتگی کا طائرِ خوش رنگ اڑ نہ جائے
دامِ خیال میں اسے لانے کی فکر کر

ہے انبساط خیز، اگر دل سے ہو ریاض
فکرِ رسا کو اس سے ملانے کی فکر کر

سید ریاض حسین زیدی

ادب کا دوسرا نام _ ریاض زیدی

ادب افق پر دمک رہا ہے ریاض زیدی
اسی کے نور ادب سے روشن، سخن کی وادی، ادب کا منظر
ادب کی ہر صنف اس کے دم سے، معزز و معتبر ہوئی ہے
ہے اس کی نعتوں سے مدحتوں کی بہار ہر سو
ہے عشق احمد کا نکھرا نکھرا نکھار ہر سو، خمار ہر سو
غزل بھی زیدی کی منفرد ہے
وہ جب تغزل کا پیراہن اوڑھ کر طلوع ہو
تو حیرتوں کے جہان حیرت سے دیکھتے ہیں
ہے اس کے نور قلم سے روشن، جہان فن اور ادب کا گلشن
ادب پہ اس کے ہیں گہرے سائے،
بتا رہی ہے ___ ادب سرائے
نہ جانے کتنے ہی معتبر لوگ بن کے مہماں،
ادب سرائے میں آ چکے ہیں
ادب کو وہ جگمگا چکے ہیں
ریاض زیدی ادب سرائے کا سائباں ہے،
گھنیری چھاں ہے
یہی سرائے ادب کا ہے معتبر حوالہ، اسی کے دم سے
ادب نگر میں کھلا اُجالا
ہر ایک صنف سخن میں اعجاز لہجہ، ریاض زیدی دکھا رہا ہے
سلام شبیر، نعت احمد یا حمد خالق، ہو منقبت یا غزل کا جادو
وہ سننے والے کے سر پہ چڑھ کے یوں بولتا ہے،
ادب کے موتی وہ رولتا ہے
نہ جانے کتنے ہی اعلیٰ اعزاز ان کے سر پر سجے ہوئے ہیں،
جو معتبر تر بنے ہوئے ہیں

شکوہ الفاظ کے دریچوں سے جھانکتی ہے،
بلاغت و سادگی سلاست
اٹل صداقت، ریاض زیدی کی قامتوں کو بڑھا رہی ہے،
بتا رہی ہے کہ اس کا اب معتبر حوالہ، اُجالا بن کے
نگر نگر میں نکھر رہا ہے
وہ رات دن خدمت ادب میں، مگن ہوا ہے،
وہ چاند سورج ستارے سارے،
سمیٹ کر دامن ادب میں
وہ رفعتوں کا گگن ہوا ہے، خیال سود و زیاں
سے بالا، وہ، خدمت علم و فن میں
کچھ ایسے، کھو گیا ہے
کہ علم و فن کا ہی ہو گیا ہے، ادب پہ اس کا گھنیرا
سایہ بتا رہا ہے
ریاض زیدی، ادب یہ دونوں، جدا نہیں ہیں
جو سچ پوچھو، تو دوسرا نام ہے ادب کا، ریاض زیدی

احمد جلیل

سید ریاض حسین زیدی پر اہل فن کی مختصر آرا

.....امین راحت چغتائی.....

پروفیسر زیدی کی شاعری مدرک بھی ہے اور محرک بھی۔ علم و عرفان نے بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں لہٰذا وہ زہر ہلاہل کو قند نہیں کہتے۔ تجربے اور مشاہدے کے عمل میں تسلسل کو برقرار رکھتے ہیں جس سے ان کا لام جل احلا سا لگتا ہے۔ وہ اجتماعی فہم کی اہمیت کے قائل ہیں لیکن انفرادی تجربے کو جلا بخشنے سے فرض سے بھی غافل نہیں۔

.....سلیم اختر.....

پروفیسر سید ریاض حسین زیدی سے تب کا یارانہ ہے جب ہم دونوں گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان میں نوگرفتار پرندوں جیسے ''پروفیسر تھے''۔ چالیس سال قبل قبلہ زیدی سے خلوص اور یگانگت کا جو رشتہ استوار ہوا، ہنوز برقرار ہے۔ مکانی بعد کے باوجود بحیثیت شاعر ریاض حسین زیدی میں تمام شعری اصناف میں طبع آزمائی کی صلاحیت تھی۔ چنانچہ غزلیں کہیں اور نظمیں لکھیں اور بحیثیت شاعر نام پیدا کیا اور مقام حاصل کیا۔ مگر گزشتہ چند برس سے عشق رسول سے سرشار ہو کر خود کو نعت گوئی کے لئے وقف کر دیا۔ ''ریاض مدحت'' پہلا نعتیہ مجموعہ شائع ہوا تو اہل دل نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور پسندیدگی کی ہوا مہک کی مانند، اُسے دُور دُور تک لے گئی۔ اب دوسرا مجموعہ ''جمال سید لولاک'' قبلہ زیدی صاحب کے تخلیقی سفر کا سنگ میل ثابت ہوگا۔ بحیثیت نعت گو سید ریاض زیدی صاحب کا یہ وصف خاص ہے کہ وہ عشق رسول کی وسعت کے احساس کے ساتھ اس کی حدود کا اور اک بھی رکھتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے اس لئے اُن کی نعت میں سادہ جذبات سادہ اسلوب میں جگہ پاتے ہیں۔ لہٰذا غلو سے بچے رہتے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ خوش ذوق حضرات ''جمال سید لولاک'' کا خوش دلی سے استقبال کریں گے۔

.....ریاض مجید.....

سادگی و سلاست ریاض حسین زیدی کی نعت گوئی کا نمایاں وصف ہے خصوصاً ان کی چھوٹی بحروں میں لکھی ہوئی نعتیں اس اعتبار سے بہت مؤثر ہیں کہ ان میں از دل خیزد بر دل ریز دوالی تاثیر موجود ہے۔ ان میں سے بھی وہ نعتیں زیادہ پُر اثر ہیں جو ردیف کے بغیر ہیں۔ ایسی نعتیں تعداد میں کافی ہیں اگر انھیں

بعد اگانہ طور پر ایک ساتھ پڑھا جائے تو یہ ایک ہی طویل نعت کے مختلف اجزا لگتے ہیں ایک بڑی نظم (Canto) کے چھوٹے چھوٹے بکوے میں موزیک (Moslac) طرز کی نعتیں زیدی صاحب کے وفور جذبات کی مظہر ہیں۔ ان میں سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ محبت کے ساتھ آپ کے اسوۂ حسنہ کے مختلف پہلوؤں کا بیان ہے۔ یہ ساری نعتیں کمال کی سادگی اظہار، وابستگی جذبات اور فرط عقیدت کی ترجمان ہیں۔

.....خورشید رضوی.....

سید ریاض حسین زیدی کی عمر دشت ادب کی سیاحی میں گزری اور بالآخران کا سارا سلیقہ ادب نعت کے فن شریف میں صرف ہوا۔ اُن کا اولین مجموعہ ، ''نعت ریاض مدحت'' چار برس پیشتر منصۂ شہود پر آ کر ملک کے چیدہ و نامور اہل قلم سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے اور اب دوسرا مجموعہ جمال سید لولاک آپ کے ہاتھ میں ہے۔

سید ریاض حسین زیدی کاوش نعت کو جہانِ فکر میں خیر آفرینی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُن کی نظر میں عقیدت کے بغیر لفظ مفہوم سے عاری رہتے ہیں۔ تاہم انہیں یہ ادراک بھی حاصل ہے کہ محبت و عقیدت کے قرینوں میں پہلا قرینہ ادب کا ہے جس کے لئے جذبے کے وفور کو پابند شعور رکھنا لازم ہے۔ چنانچہ وہ نعت کہتے ہوئے ، دل بے تاب کو حد ادب یاد دلاتے رہتے ہیں۔ خاک در حضور میں انہیں تمام ظلمتوں کو نگل جانے والا سیل اور دکھائی دیتا ہے، زمین میں نعت سے آسمان ہوتی نظر آتی ہے اور وہ عاجزانہ نعت کی سرشاری میں بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں۔ بحمد اللہ ثنائے خواجہ نے توفیق بخشی ہے۔

ریاض نعت کا سرمایہ میرا اصل دیواں ہے

.....

نصیبوں کی اس یاوری پر میں زیدی صاحب کی خدمت میں تہنیت پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ ان کی یہ پُرخلوص کاوش قبول عام اور ثواب دوام سے سرافراز ہو۔

.....خورشید بیگ میلسوی.....

سید ریاض حسین زیدی دیار روایت اور زمانہ جدت کے امتزاج سے وہ نعتیہ حسیت پیدا کرنے میں ماہر ہوئے ہیں، جو انھیں کا حصہ ہے۔ انھوں نے اپنے قلم کی رفعت کو دل و دماغ کی مقدسات کو خانہ الفاظ و تراکیب سے منزہ کیا اور پھر خوش بو، رنگ، نزہت نکہت روشنی کی روشنائی سے انھیں خامہ ہدایت پر رقم کیا۔ مضامین کی نئی جہات کی عطا نئد قبولیت سے کم نہیں۔ بہت زیادہ لکھنے کے باوجود مضامین کا خوع، ندرت اور عدم تکرار کرامت تخلیق سے کم نہیں۔

.....سعود عثمانی.....

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بے شمار معجزات میں سے ایک یہ بات بھی ہے کہ چودہ سو سال سے عشاق آپ کی ذات گرامی کو نثر و نظم کا محور قرار دیئے ہوئے ہیں اور اظہار کی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مضامین نو کے انبار لگے ہوئے ہیں لیکن نہ کہنے والے ختم ہوتے ہیں نہ کہنے کی گنجائش ختم ہوتی ہے۔ یہ بے مثال محبوبیت اور باکمال جاذبیت آپ کی ذات اقدس کے علاوہ کائنات میں کسے نصیب ہے اور یہ والہانہ شیفتگی اور عاشقانہ وارفتگی آپ کی امت کے سوا کسے حاصل ہو سکتی تھی۔ سو یہ سلسلہ جاری و ساری ہے اور ان شاء اللہ قیامت کے بعد بھی جاری رہے گا۔

سید ریاض حسین زیدی اسی سلسلہ الذہب کی ایک جند گائی کڑی ہیں۔ انہیں خالق سخن نے اس توفیق خاص سے نوازا ہے جو کسی نعت گو کو مسلسل اور ہموار طور پر مدرج پیمبر کی صورت میں عطا ہوتی ہے ان کی نعت گوئی اس عشق کی بھی منظر ہے جو انہیں سید المرسلین کی ذات اقدس سے ہے اور اس تخلیقی توانائی کی نماز بھی جو انہیں ہر دم توصیف پیمبر پر آمادہ رکھتی ہے۔ زیدی صاحب کی یہ پر سوز نعتیں ایسے صاحب دل کی عکاس ہیں جو نئی چھنگی سے بھی مالا مال ہے اور نعت کی عظیم روایات سے بھی اچھی طرح آشنا ہے۔

کسی بھی نعت کی معراج اس کا بارگاہ نبوی میں قبول ہو جانا ہے۔ سو میں دل سے دعا گو ہوں کہ سید ریاض حسین زیدی صاحب کا یہ ''ریاض مدحت'' ان کے نانا شفیع المذنبین نبی کریم کی بارگاہ میں قبول ہو اور انہیں اس کے صلے میں مزید توفیق نعت ارزانی ہو (آمین)

.....واجد امیر.....

پاکیزہ خیالات اُن کی دھلی دھلائی شاعری کا مخزن ہیں۔ ان کا شعری رویہ معذرت خواہانہ ہرگز نہیں ہے۔ تیقن ان کی اساس ہے مگر اس سب کے باوجود ان کی شاعری کسی زاہد خشک کی شاعری نہیں بلکہ شعری حیثیت سے بھرپور، دلوں کو چھوتی ہوئی جہاں تسکین ذوق کا باعث ہے، وہیں مبتدی حضرات کے لیے منصب نصاب بھی سنبھالے ہوئے ہے۔

.....جمیل احمد عدیل.....

زیدی صاحب کے زیر نظر شعری مجموعے 'اے رسول امیں' کا ہر لفظ حمد و نعت کی ابدی صداقت سے اس لیے بھی مستنیر ہے کہ یہاں عقیدت نے ہی اعتقاد سے زیست کشید کرنے کے بجائے علم و فکر کے مصادر سے اپنا ناتا جوڑا ہے۔ ریاض صاحب نے عمر بھر اپنے ریاض کا محور حرف جگر کو قرار دیے رکھا۔ ان کی نگاہ نے دزدیدگی یا منظور سے گریز کا ہنر سیکھنے کو اپنے ضمیر کے خلاف گواہی یقین کیا کہ انھیں خوب ادراک ہے، الراسخون فی الاعلم کے لیے ہی استثار کھا گیا ہے۔ یہی وہ صورت ہے جہاں شعر اور سچ مترادف عمل کا حصہ ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆.....

''ریاض مدحت''.....سید ریاض حسین زیدی

ظاہری و باطنی خوشبوؤں سے مالا مال ''ریاض مدحت'' سید ریاض حسین زیدی کی پُر تاثیر، ایمان افروز اور دلکشا نعتوں کا اولین مجموعہ ہے۔ سید ریاض حسین زیدی وہ خوش قسمت نعت گو شاعر ہیں جن کی نعتیں دل پاکیزہ، روح مصفا اور ایمان تازہ کی مظہر ہیں۔ جن سے حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ایک سچے عاشقِ رسول ہیں۔ ان کی نعت گوئی کا اسلوب اور فنی مہارت ان کی سلطان عرب، تاجدار حجم سے بے پناہ محبت، فطری لگاؤ، انتہائی عقیدت اور بے انداز و احترام کی عکاس ہے۔ ان کے اس مجموعہ نعت میں اظہار بیان کی پختگی، حضور سے والہانہ وابستگی، صفائے قلبی، ریاضت باطنی، حب نبوی اور سنائے خواجہ کے بے شمار مظاہر ہیں۔ اس طرح سید ریاض حسین زیدی حضور کی ثناو توصیف میں مخمور ان نعت گوؤں میں شامل ہو گئے ہیں جنھوں نے ازل سے ابد تک اپنے دامنوں کو اس سعادت کی خوشبوؤں کے اثاثے سے بھر لیا ہے۔

سید ریاض حسین زیدی خوش قسمتی سے ان نعت گو شعراء کی صف میں شامل ہیں جنھوں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثناو توصیف سے اپنی مقبول عام شاعری کا آغاز کیا اور اس طرح نعت کہنے کی سعادت اور ثواب اپنے نامہء اعمال میں شامل کر لیے۔ انہوں نے حضور ختمی مرتبت رسولؐ اللہ سے اپنی فکری وابستگی اور ذہنی اور قلبی لگاؤ برقرار رکھنے کے لیے بے شمار نعتیں کہی ہیں اور یوں ایک مختصر مدت میں دنیائے شعر و سخن میں ساہیوال کو برصغیر میں ایسا مقام دلوانے میں سرخرو ہو گئے ہیں کہ اب ساہیوال کے نام میں غزل اور نظم کے ساتھ خوبصورت نعت کا حوالہ زیادہ پختگی اور احترام کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں سید ریاض حسین زیدی پر رحمتہ اللعالمین کا یہ فیضان ہے کہ ان کے سخن کو اس رنگ میں رنگ دیا گیا ہے کہ ان کی نعت کا ایک ایک شعر، ایک ایک لفظ ایک ایک سطر ایمان و آگہی کی خوشبوؤں سے معطر ہے اور یہ خوشبوئیں چار دانگ عالم میں پھیل

سید جعفر شیرازی

محترمہ سیدہ آمنہ ریاض، جناب سید ریاض حسین زیدی اور جناب ناصر بشیر۔

کرامت حضور کے لیے سامان رشد و ہدایت فراہم کررہی ہیں:

جھوم اٹھتا ہے مرا وجدان ایسا نام ہے
آنکھ زندہ ہے کہ اس کو خواہش دیدار ہے

.....

سید ریاض حسین زیدی کو اس بات کا عرفان ہے کہ نعت کہنے کے لیے حبِّ رسول پاکیزگی، قلب، صفائے باطن، روح مصفا، الفت حضور کی سرشاری، جذبوں کی مخموری اور ان کی ذات والا صفات سے عقیدت واحترام بہت

سید ریاض حسین زیدی وہ شیدائے رسول ہیں کہ نعت گوئی کے آغاز کے ساتھ ہی ان کو روضہ رسول کی زیارت نصیب ہوگئی۔ جوان کی عقیدتوں، محبتوں اور اطاعت رسول کا اجر ہے۔ ہر مسلمان ایسے اجر کی تمنا رکھتا ہے لیکن:

ع یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ضروری ہے اور جب وہ ان میں جذب ہو کر نعت کہتے ہیں تو ان کی نعت روح پرور کیفیتوں سے فضائے عالم کو معطر کردیتی ہے۔

☆☆☆☆☆

جناب سید ریاض حسین زیدی اور جناب انجم سلیمی

جناب ریاض حسین زیدی ایک تقریب میں۔

نعت نگاری میں نئے امکانات

ایمان کی اصل عشق رسالتؐ مآب ہے مگر دعویٰ عشق کرنے کا وہی مجاز ہے جس کا کردار و عمل حضورؐ کے اسوۂ حسنہ سے رہنمائی کے نتیجے میں آئینے کی طرح شفاف ہو۔ ہم رسماً محبت کا اظہار کرتے ہیں مگر ہمارے صبح وشام زندگی دنیاوی محبت میں گزرتے ہیں۔ اگر ہم صدق نیت کے ساتھ اپنی گفتار اور کردار کو آقائے دوجہاں کی خوشنودی کے حصول کی خاطر آئینہ یک دگر بنالیں تو ہم کامیاب و کامران ہو جائیں گے، ہماری بات میں اثر ہو گا۔ حسن عقیدت اپنے شباب پر ہوگا۔ ہم رسولِ امیںؐ کے عشق میں سرشار ہو کر شعروادب کے پڑھنے میں تطہیر نفس کا مرحلہ طے کر سکتے ہیں۔

ہمارے سامنے سید ریاض حسین زیدی کا نعتیہ مجموعہ ''اے رسولِ امیںؐ'' شہادت پیش کر رہا ہے کہ ان کی ساری ریاضتوں کا آب و رنگ آرائش فردوس بریں کے لیے وقف ہو چکا ہے۔ یعنی ریاض ثمر بار کیا جا رہا ہے:

یہ انؐ کی مدح سرائی کا فیض ہے سارا
ہر ایک شخص ریاض اپنا قدردان ہوا

.....

ریاض زیدی مکمل شاعر ہیں۔ سخن شناسی اور سخن وری ان کے خمیر میں گندھی ہوئی ہے۔ وہ غزل میں اساسی عناصر کے ساتھ نعت کے حسن و جمال اور خوبصورت استعارے برت کر تغزل میں نئے امکانات پیدا کرنے کا ہنر آزماتے ہیں۔ اسی طرح وہ نعت میں روایتی مضامین سے بڑھ کر عقیدت و محبت کے نئے انداز اور عشق نبیؐ کی دل نشین آواز کے زیر و بم سے فنی لوازمات کا اہتمام کرتے ہیں اور فکری تحریک کو نمایاں کرنا لازمی قرار دیتے ہیں:

معطر ذکر ہے فکر و نظر کا
بیاں ہے نعت کے ارفع ہنر کا

تصور ہی مرے مولا کے در کا
نوید جاں ہے اک جلی سحر کا

جہانوں میں بڑے شہر شرف ہیں
مگر رتبہ کہاں آقاؐ کے در کا

.....

حضور پاک احمد مجتبیٰؐ شہر علم اور اس شہر علم کا در علیؑ ابن علی طالب ہیں۔ شاعر ارادی یا غیر ارادی طور پر سرمست و بے خود ہو کر جب ایک دریوزہ گر کی طرح صدا کرتا ہے تو

حسن عسکری کاظمی

خود کو فقیر بے نوا بتا کر پکار اٹھتا ہے کہ:

مریضان غم کی شفا آپؐ ہیں
شکستہ دلوں کی بقا آپؐ ہیں

.....

بسا آنکھوں میں انؐ کا نقش پا ہے
فروزاں ہو گیا ہر راستہ ہے

.....

میں بھی ریاض حلقہ بگوش رسولؐ ہوں
کیف آفریں ثنائیں یہ نذر رسولؐ ہیں

.....

شاعر تو اسرار حقیقت کا راز دار اور واقعات کا مبصر ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنی علمیت کے اظہار کی خاطر شعر نہیں کہتا بلکہ وہ اپنے خون جگر سے گلستان سخن کو سیراب کر کے سرسبز و شاداب بنا دیتا ہے، سید ریاض حسین زیدی کے پاس خداداد ذہانت اور عقیدت کا وافر خزینہ موجود ہے۔ ان کی نعت میں دل کشی و رعنائی اور ندرت و رفعت کے ساتھ دل میں جذبہ محبت پایا جاتا ہے۔

رسولؐ خدا، محبوبؐ خدا ہیں اس لیے آپؐ کی ذات گرامی سے لے کر صفات نبویہ تک اور افکار عالیہ سے لے کر اعمال صالحہ تک ہر پہلو نعت کا موضوع بنانے پر تخلیقی ہنرمندی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہ نعت میں گنبد خضریٰ کے مکیں کا ذکر جمیل کرتے ہوئے دعا اور التجا کو یک جا کرنا پسند کرتے ہیں:

ہر ذرہ خاکی بھی چمک اٹھا ہے بے حد
احسان ہے یہ گنبد خضریٰ کے مکیں کا

.....

جب جالیوں سے آپؐ نظر آتے ہیں مجھ کو
حظ آفریں نظارہ ہے یہ قلب حزیں کا

.....

وہ در پہ بلائیں گے ریاض آپ کو اک دن
یہ حاضری احسان ہے بطحا کے امیں کا

.....

نعت کہتے ہوئے ریاض زیدی عام فہم اور روزمرہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ شعر کے ابلاغ کی اہمیت کے پیش نظر ابہام

جناب سید ریاض حسین زیدی اور جناب اعجاز رضوی۔

یا معانی میں گنجلک کو قطعاً پسند نہیں کرتے۔ اس لیے ان کی نعت کے اشعار قاری کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ نعت گوئی میں زبان پر قدرت شرط اول ہے، کچھ شعرا حضورؐ کی محبت میں اس قدر غلو سے کام لیتے ہیں جس سے حضورؐ کے خلق کی تنقیص ہو جاتی ہے۔

نعت نگاری کے لیے تاریخ، سیرت، حدیث اور حضورؐ کے معمولات زندگی کا مطالعہ ضروری ہے۔ نعت کہنے میں حزم و احتیاط کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنا اور خضوع و خشوع کے ساتھ بارگاہِ رسالتؐ میں کامل مودت کا لحاظ رکھتے ہوئے اظہار عقیدت بجا لانا ضروری ہے، یہ وہ عبادت ہے کہ جس کا صلہ دنیا کے بجائے آخرت میں آپؐ کی شفاعت کی صورت میں ملنے کا یقین کامل ہے۔ ریاض زیدی کی نعت گوئی میں جو اختصاص پایا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ ان کو اپنی عاقبت سنوارنے کا خیال دامن گیر رہتا ہے۔ وہ عالم اسلام کی زندہ اکائی کو برقرار رکھتے ہوئے ہر قسم کی عصبیت سے پاک زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اخلاص عمل کے ساتھ حضورؐ کی بارگاہ سے وابستہ ہیں۔ یہی ان کے عشق نبیؐ کا امتیاز ہے:

سارے جہاں کو درس دیا اتحاد کا
معدوم ہو کے رہ گئی تفریق ذات پات

حب رسولؐ، حب خدا ہی کا نام ہے
جو ہو گیا رسولؐ کا اس کی بنی ہے بات

.....

ہر پل ریاض دل سے یہی آئی ہے صدا
ارفع ترین آپؐ ہیں صادق امین آپؐ

.....

جو بھی رکھتا ہے آپؐ پر ایمان
سجدہ شکر وہ بجا لائے
میں ریاض نبیؐ میں رہتا ہوں
ابر رحمت کے ہیں جہاں سائے

☆☆☆☆☆

جناب ریاض حسین زیدی ادب سرائے کے مہمانان گرامی کے ساتھ۔

ایک صاحب دل غزل گو

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصر.....
یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو اور ہمارے محترم و مکرم بزرگ شاعر جناب پروفیسر ریاض حسین زیدی صاحب ایک مدت سے قریہ شاعری میں قافیہ پیما ہیں، اور اُن کی یہ قافیہ پیمائی ناصر کاظمی کے متذکرہ مشہور شعر کی گہرائی و گیرائی کی تہ نشیں ہوتے ہوئے بھی معنویت کی اُس بلندی پر ہے جہاں عصرِ جدید کے سبک رفتار نوجوان غزل گو شعرا کی نگاہیں اسلوب غزل کو کسی خاص انداز سے دیکھنے اور غزل کی طلسماتی جلوہ نمائی میں مصروف ہیں، مگر اپنی بزرگانہ ریاضت کے باعث ان کا تخلیقی رویہ اس سے گریز پائی کی طرف مائل ہے۔ احمد فراز نے شہزاد احمد صاحب سے یا غالباً شہزاد صاحب نے احمد فراز صاحب کی مائل بہ طوالت ایک دو غزلوں کو پڑھ کر کہا تھا کہ طویل غزل میں ایک خوبی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ قافیوں کے استعمال سے معنوی امکانات میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ بھی بہرحال ایک خوبی ہے، جب کہ زیدی صاحب کی اکثر غزلیں طویل ہیں اور اس طوالت میں انھوں نے متذکرہ خوبی سے بھرپور فائدہ اُٹھایا ہے۔ غزل نے اپنے کلاسیکی رنگ سے آگے بڑھتے ہوئے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے درمیان کتنے زاویے تبدیل کیے، کتنے رنگ اختیار کیے اور کیا کیا عشوہ طرازیاں اور جلوہ نمایاں دکھائیں، یہ تجزیہ بجائے خود ایک وسیع مطالعہ کا متقاضی ہے۔ ہمارے ناقدانِ فنِ شعر نے تو اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ یہاں اس پر مزید خامہ پردازی محض خامہ فرسائی کے مترادف ہوگی۔ مجھے تو صرف اتنا کہنا ہے کہ غزل نے اب تک جو بھی رنگ یا اسلوب اختیار کیا، لے دے کے غزل غزل ہی رہی اور رہے گی، ہاں جب تک غزل میں تغزل کی چاشنی اور رمزیت کی خوبی نہیں ہوگی، غزل ''برگ گل شاداب ہے'' غزل کہلانے سے شرمندہ رہے گی۔ شاید اسی شرمندگی سے بچنے کے لیے فیشن کے طور پر یار لوگوں نے آزاد غزل بھی لکھ ماری، حال آں کہ اس آزادی کے لیے نظم ہی کافی تھی۔ خیر لکھتے لکھتے یہ جملہ معترضہ سرزد ہو گیا، میں خود ہی شرمندہ ہوں، غزل کو آزادی کی بھینٹ چڑھانے والے کیوں شرمندہ ہوں؟
جناب ریاض حسین زیدی کا سفر شعر اگرچہ ایک مدت سے جاری ہے، بالخصوص نعت

خالد علیم

کے حوالے سے ان کے مجموعات خاصی پذیرائی حاصل کر چکے ہیں کہ اس باب میں اُن کا قلم سیدِ سادات، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص عنایتوں اور خود شاعر کی آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دلی محبتوں کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اس لحاظ سے اُن کی بنیادی پہچان نعت گو شاعر کی ہے۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ وہ قریہ غزل میں کب سے خراماں ہیں تاہم اُن کی غزل گوئی اور تخلیقی روم کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ میدانِ غزل کے بھی شاہ سوار ہیں۔ وہ اپنے مخصوص طرز و اظہار کے شیدا ہیں۔ اُن کے زبان و بیان میں سادگی کے عنصر کے ساتھ ساتھ نظر آمیز انداز نظر بھی موجود ہے جسے کہیں کہیں مابعد الطبیعیاتی عناصر نے تشکیل دیا ہے اور اس لحاظ سے فکر کی گہرائی، خیال کی نزاکت اور احساس کی لطافت سے وہ گریز پا نہیں، تاہم اُن کا تخلیقی کرب تغزل کے نیم وا دریچوں سے گزرتا ہوا آرائشِ بیان کے خوش آہنگ منظروں میں وسعت پذیر ہوتا ہے۔ اُن کے فکری طرز و آہنگ میں معاشرتی ناہمواریوں، فرد کے اخلاق و کردار کی خامیوں اور فرسودگیوں پر براہ راست تنقید کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے اور یوں اُن کا تخلیقی سطح نظر سراسر تعمیری ہے۔ حالی کی طرح اُن کی غزل گوئی کا بنیادی مقصد معاشرے کی اصلاح و ترقی ہے اور اس پہلو سے اُن کا جذبہ تعمیر ناامیدی سے آشنا نہیں:

ناامیدی جذبہ تعمیر کی توہین ہے
کامرانی ہے ریاض اپنا مقدر آج بھی

.....

ایک صاحب دل شاعر (اگرچہ صاحب دل ہونے کی صفت تو سب سے زیادہ شاعر ہی میں ہوتی ہے) یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے اردگرد کی مسمومیت سے بے نیاز نہ گزر جائے اور ''برگ گل شاداب ہے''
زندگی کی فرسودگیوں کی نشان دہی اور نوحہ زنی کے بجائے مصنوعی آسودگیوں پر نغمہ زن رہے، دور نہ اُس کی مثال تو اُس طاؤس جیسی ہے جس کے بارے میں احمد فراز نے کہا تھا: ''جنگل میں مچل رہے ہیں شعلے طاؤس کو رقص کی پڑی ہے'' پھر عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ شاعر معاشرے کا محض عکاس ہے، مبلغ نہیں۔ اس کا یہ ہرگز فریضہ نہیں کہ اصلاح و ترقی کے لیے اپنے فکر و نظر کے زاویے تراشتا پھرے۔ اس کا کام محض اپنے جذبات و احساسات پر منعکس ہونے والے منظر نامے کو پیش کرتا ہے۔ مگر زیدی صاحب کا کلام اپنے عظیم ترین پیش رو حالی، اقبال، اکبر اور اس قبیل کے دیگر شعرا کی طرح اس نظریے کی کھل کر تردید کرتا ہے۔ اُن کی شاعری کی اعلیٰ ترین صفت اسی مقصدیت کے تابع دکھائی دیتی ہے جسے متذکرہ شعرا نے اختیار کیا اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ:

رجوع خیر کی صورت گری بھی ممکن ہے
خفیف ہو کے غم رایگاں کی بات کریں

.....

گویا معاشرے کی شر انگیزیوں کی زد میں غم رایگاں کا پہلو ضرور ہے مگر رجوع خیر کی صورت گری کے امکان کو بھی وہ رد نہیں کرتے اور یہی ان کی شاعری کا بنیادی مقصد ہے۔ کلاسیکی غزل گو شعرا نے رمزیت اور اشاریت سے تغزل کے لیے دیگر اصناف سخن کے مقابل جو امتیازی خدوخال ترتیب دیئے تھے، نئی غزل میں بھی یہ سلیقہ اظہار موجود ہے البتہ کہیں کہیں بعض شعرا نے نظم کے اسلوب کو بھی غزل کے اسلوب میں ڈھالنے کی کوشش کی، یا یوں کہہ لیں کہ غزل کو نظم کے قریب تر کرنے کا شعوری یا غیر شعوری پیرایۂ اظہار اختیار کیا۔ لیکن جدید تر غزل نے جو سلیقہ وضع کیا، اس میں زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ فکر و آہنگ، اسلوب کی تازگی اور اپنے عہد کے سماجی رویوں کو خارجی اور ذاتی تجربات کی تفہیم میں غزل کے علامتی انداز اظہار اور جمالیاتی حسیات کے ساتھ بیان کرنے کا شعور دیا۔ البتہ غزل کی تہ داری اور جمالیاتی حسیات پر پوری اترنے والی شاعری بعض اوقات ترسیل معنی میں مشکل کا باعث بنتی ہے اور عام سطح پر حرف و صوت کی جمالیاتی تاثر پذیری بھی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ چناں چہ فکر و نظر کی اصلاح کے ساتھ ساتھ وہ ریاضت فن کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ غزلوں کے اکثر مقطعوں میں انھوں نے اپنے تخلص کو معنوی رعایت سے پیش کیا ہے۔ بالخصوص اپنے ایک مقطع میں تو انھوں نے فن شعر کی ریاضت سے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ۔

''سب بصیرت ریاض ہی سے ملی تجربہ کر کے برملا دیکھیں'' اور یہ تجربہ اُن کے تخلیقی مزاج کا سرنامہ ہے۔ ایک خاص بات جو اس مجموعے کی غزلوں میں نظر آتی ہے وہ اُن کی غزلوں کے انتسابات ہیں جو انھوں نے اپنے عزیزوں، دوستوں، قدر شناسوں اور محبان خاص کے لیے پیش کیے ہیں۔ حمد کے بعد تبرک کے طور پر نعت و سلام اور پھر ہر غزل کا انتساب کسی نہ کسی شخصیت کے لیے ہے، یہاں تک کہ ایک غزل خاکسار کی نذر بھی کی گئی ہے۔ میں تو ان کی اس کرم فرمائی کے لیے دل سے ممنون ہوں اور یقیناً سب ہوں گے۔ اور جو دنیا سے رخصت ہو چکے، ان کے لیے بھی ان کی محبتیں اسی طرح تازہ ہیں، جیسی ان کی زندگی میں رہی ہوں گی۔ یہ تمام نذرانے ان کی اپنوں سے قربتوں کے غماز اور اس مجموعے Presentation میں اُن کے جذبہ دل کے عکاس ہیں۔ جہاں اُن کی شاعری میں مقصدیت کی روح کارفرما ہے وہاں یہ پہلو بھی اُن کے قلب مصفا کا آئینہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ خلوص جذبہ دل ہر کسی کے بس میں نہیں مجھے امید ہے کہ اُن کے نعتیہ مجموعوں کے بعد اُن کا یہ پہلا مجموعہ غزل بھی مقبولیت و پذیرائی حاصل کرے گا۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر سید ریاض حسین زیدی.....ایک بلند پایہ علمی و ادبی شخصیت

پروفیسر سید ریاض حسین زیدی ایک باکمال اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں انھوں نے تمام عمر گلستانِ شعر وادب میں لاتعداد تخلیقی پھول کھلائے اور ان کی دل و جان سے آبیاری کی بے لوث خدمت کے جذبے سے سرشار اس بے مثل شخصیت کی علمی، ادبی انتظامی اور دیگر صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف اور گرویدہ ہے . . .

پروفیسر سید ریاض حسین زیدی شعبۂ تدریس سے 36 برس وابستہ رہے۔ بسلسلہ ملازمت وہ جہاں جہاں بھی تعینات رہے انھوں نے ہر جگہ اپنی یادوں اور بے بہا خدمات کے انمٹ نقوش چھوڑے اور اپنے چاہنے والوں کا وسیع حلقہ بنانے میں کامیاب رہے اور ان کے دلوں کی دھڑکن بن گئے..... مجھے بھی ان سے بہت کچھ سیکھنے کے بے شمار مواقع میسر آئے.....تہذیبی اور سماجی رویوں کی پاسداری کا فریضہ انھوں نے یہ احسن نبھایا ان کے دروازے ہمیشہ آنے والوں کے لئے کھلے رہے اور علم کی ترویج کا سلسلہ جاری وساری رہا انہیں اگر کسی طالبعلم میں کوئی صلاحیت نظر آئی تو انھوں نے اس کی بہترین انداز میں تراش خراش اور عمدہ انداز میں تربیت کر کے اسے انمول ہیرا بنا کر ہی دم لیا..... سید ریاض حسین زیدی ایک مجلسی شخصیت ہیں انھوں نے احباب کو جمع کر کے کسی نہ کسی مثبت سرگرمی کو ہمیشہ جاری رکھا اور احباب کی تواضع اور خاطر مدارت کی کوئی نہ کوئی صورت ہمیشہ نکالے رکھی... ادبی خدمت کا ایک جنون تھا جس نے تمام عمر انھیں متحرک اور تروتازہ رکھا۔ سال ہا سال سے ماہانہ علمی اور ادبی اجلاس تواتر سے کرانے والی ان کی تنظیم ''ادب سرائے ساہیوال'' آج بھی اپنے تسلسل کو قائم رکھے ہوئے ہے اس پلیٹ فارم نے جہاں نئے لکھنے والوں کی بہترین انداز میں تربیت کی وہاں سیر کو بھی اپنے علمی اور ادبی ذوق کی تسکین کے لئے سازگار ماحول فراہم کیا ادب سرائے ساہیوال کے ماہانہ پروگراموں میں ملکی سطح

علی رضا

جناب علی رضا، جناب ذکا اللہ انجم ملتانی، جناب ممتاز راشد لاہوری، جناب اعظم کمال، جناب سعید اقبال سعدی اور جناب سید ریاض حسین زیدی۔

کی بہت سی بلند پایہ شخصیات بھی شریک ہو کر ان کی رونقوں میں اضافے کا باعث بنتی رہیں۔ سید ریاض حسین زیدی ایک خوبصورت شخصیت کا نام ہے جس میں محبت ہی محبت اور اخلاص ہی اخلاص بھرا ہوا ہے وہ ایک دردمند دل رکھنے والے اور حساس طبیعت کے مالک ہیں انھوں نے ہمیشہ معاشی طور پر کمزور اور ناآسودہ احباب کی نہایت خاموشی سے مدد کی اور مشکل کے ہر موقع پر ان کے ساتھ کھڑے ہوئے... گورنمنٹ کالج ساہیوال کے عرصہ تعیناتی کے دوران جہاں انھوں نے بڑی جانفشانی سے تدریسی ذمہ داریاں ادا کیں وہاں بطور مدیر اعلیٰ ادارے کے علمی و ادبی میگزین ساہیوال کی اشاعت میں بھی خوبصورتی سے کئی رنگ بھرے اور کئی یادگار نمبرز کی اشاعت بھی انھیں کی شبانہ روز کاوشوں سے ممکن ہو سکی۔ پروفیسر سید ریاض حسین زیدی کا شمار عہد حاضر کے مستند اور نامور نعت گو شعرا میں ہوتا ہے ان کی نعت عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کئی دلفریب کیفیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے نعتیہ شاعری پر مشتمل ان کے تین مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے جن میں سے دو کو حکومت پاکستان اور پنجاب حکومت کی طرف سے قومی اور صوبائی سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا... ہماری خوش بختی ہے کہ پروفیسر سید ریاض حسین زیدی جیسی نابغہ روزگار شخصیت ہمارے درمیان موجود ہے ایک زمانے نے ان سے فیض اٹھایا۔ ان کے بہت سے ماندہ اس وقت امتیازی مقام و مرتبے پر فائز ہوتے ہوئے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ پروفیسر سید ریاض حسین زیدی جیسی باغ و بہار شخصیت کو تادیر سلامت رکھے اور وہ اسی طرح حقوق خدا میں آسانیاں بانٹنے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے فروغ میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرتے رہیں . . . اک زمانے کو ناز ہے جن پر بالیقیں وہ ریاض زیدی ہیں۔

☆☆☆☆☆

سید ریاض حسین زیدی کی حیات اور شعری کائنات

Absatract: *Prof.Syed Riaz Hussain Zaidi, a literary intellectual and scholar of Sahiwal, has strong relation with poetry and literature spanning about half century.He has devoted his whole life for teaching.Mr. Zaidi established a literary organization "Adab Saraye" on August 23, 1992. "Adab Saraye" is still an active organization, which is holding monthly literary meetings steadily. His five creative volumes include a prose writing "Na'ay Zaiqay" , three Naat collections "Riaz-e-Midhat" , "Jamal-e-Syed-e-Laulak" and "Zikr-e-Shah-e-wala" and a Ghazal collection "Barg-e-Gul Shadab Hay".He has been awarded with a "Sadarti Award" and a "Provincial Seerat Award".In world of literature Mr.Zaidi is known as a poet of Naat and Ghazals but he has lot of other creations also.*

رحمت علی شاد

گنبدِ افلاک پر حدِ نظر تک روشنی
پرتوِ خورشید سے پہنچی قمر تک روشنی
ہو گیا بار آفریں چشمِ تلطف سے سماں
برگِ گل شاداب ہے پھیلی شجر تک روشنی
(سید ریاض حسین زیدی)

زیدی سرزمین ساہیوال کی ایک ایسی ادبی شخصیت ہیں جنہوں نے ''عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں'' کے مصداق تقریباً نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے سے علم وادب کی شمع کو روشن رکھا ہوا ہے اور علم وادب کی یہی شمع ان کے تخلیقی عمل کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے جس سے ان کا تخلیقی سفر ضیا پاشیاں کرتا نظر آتا ہے۔اس سب کے پیچھے ان کی عمر بھر کی ریاضت اور محنتِ شاقہ کا عمل کارفرما ہے۔

سید ریاض حسین زیدی سیالکوٹ کے ایک محلہ ''جامنوں'' میں سید اکبر علی زیدی کے ہاں ۱۱۔اپریل ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے جن کے تین بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔جن میں سے ایک بھائی اور تین بہنیں بقیدِ حیات ہیں ۔ زیدی صاحب ان سب سے بڑے ہیں۔انہوں نے صرف پانچ سال کی عمر میں ہی قرآن مجید ناظرہ پڑھ لیا تھا،اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا ۔ اسی طرح ۱۹۵۸ء میں انٹر میڈیٹ،۱۹۶۰ء میں بی اے اور ۱۹۶۳ء میں ایم

اے اردو کرلیا۔ ۱۹۶۳ء میں ہی گورنمنٹ ایمرسن کالج بوسن روڈ ملتان میں اردو لیکچرار اور ۱۹۷۶ء میں وہ اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے؛ اس کالج میں وہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، ڈاکٹر سلیم اختر، پروفیسر خلیل صدیقی اور پروفیسر صفدر امام جیسی شخصیات کے ساتھ پڑھاتے رہے اور ان کے معروف شاگردوں میں ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈاکٹر طاہر تونسوی ،اصغر ندیم سید، محسن نقوی، شاہد زبیر اور چیف جسٹس تصدق حسین گیلانی جیسے لوگ شامل ہیں۔

۱۹۶۷ء میں رحیم یار خاں پھر ۱۹۷۲ء میں گورنمنٹ کالج ساہیوال، پھر چھ ماہ کے لیے گورنمنٹ کالج چیچہ وطنی اس کے بعد دوبارہ گورنمنٹ کالج ساہیوال واپس آگئے؛ اس کے بعد ۱۹۸۳ء میں گورنمنٹ کالج عارفوالا میں بطور پرنسپل بھی رہے لیکن ۱۹۹۱ء میں ایک مرتبہ پھر گورنمنٹ کالج ساہیوال آگئے اور اسی کالج سے ہی ۱۱۔اپریل ۲۰۰۰ء کو ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ سید ریاض حسین زیدی کی شادی ۱۷۔اگست ۱۹۶۹ء کو سیدہ نصرت یعقوب کے ساتھ ہوئی جن سے ان کی اولاد پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ زیدی صاحب نے ۲۳۔اگست ۱۹۹۲ء کو ساہیوال میں ایک ادبی تنظیم "ادب سرائے" کی بنیاد رکھی جس کے اب تک تقریباً ۲۶۰ اجلاس ہو چکے ہیں اور یہ تنظیم آج بھی پوری آب و تاب سے فعال ہے۔ ادب سرائے کے متعلق واصف سجاد کی رائے ہے:

"شہر کی ایک فعال ادبی تنظیم "ادب سرائے" کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ اس نے بھی نوجوانوں کی فکری تربیت میں ایک اہم کردار ادا کیا اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ محترم پروفیسر سید ریاض زیدی اس تنظیم کے روح رواں ہیں"۔ ۱؎

سید ریاض حسین زیدی کی جبلت میں ہی ادب کی چاشنی موجود ہے۔ ان کے شعری سفر کا آغاز ساتویں جماعت سے ہی ہو گیا تھا۔ ان کا پہلا شعر ملاحظہ فرمائیں:

ڈرا سکتی نہیں تا زندگی دریا کی طغیانی
بڑی مدت سے ہوں میں آشنا طوفاں کے دھاروں سے

....

سید ریاض حسین زیدی کا تخلیقی سفر نصف صدی سے کچھ زیادہ ہی عرصے پر محیط ہے۔ اب تک ان کی پانچ تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں سے ایک نثری تصنیف "نئے ذائقے" ۱۹۷۹ء میں طبع ہوئی تھی۔ تین نعتیہ مجموعے، جن میں سے پہلا مجموعہ "ریاض مدحت" ہے جو جون ۲۰۰۰ء میں ادب سرائے ساہیوال سے شائع ہوا اور مذکورہ مجموعہ صدارتی ایوارڈ یافتہ ہے۔ دوسرا نعتیہ مجموعہ "جمال سید لولاک" ہے جو ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا، جب کہ تیسرا مجموعہ "ذکر شہ والا" ہے، جو یکم محرم الحرام ۱۴۳۲ ہجری کو الاشراق پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ ذکر شہ والا" کو بھی ۲۰۱۲ء میں وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف کی طرف سے صوبائی سیرت ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے اور پانچواں شعری مجموعہ "برگ گل شاداب ہے" ہے، جو ستمبر ۲۰۱۳ء میں الاشراق پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ سید ریاض حسین زیدی ایک ہمہ پہلو شخصیت ہیں۔ ادب میں جن کی اصل پہچان تو نعت گو شاعر کے حوالے سے ابھر کر سامنے آتی ہے مگر وہ تین نعتیہ

مجموعوں کے علاوہ ایک نثری تصنیف اور ایک مجموعہ غزل بھی تخلیق کر چکے ہیں۔ ان کی شخصیت کے بے شمار پہلو ہیں جن میں خوش فکر نعت گو، خوش آواز، عمدہ غزل گو، خوبصورت نثار، خطاط، شیریں بیاں مقرر، ایک اچھے استاد، اعلیٰ نقاد اور ایک اچھا انسان شامل ہیں۔

سید ریاض حسین زیدی بنیادی طور پر شاعر ہیں انہیں نعت گو شاعر یا غزل گو شاعر کہہ کر ایک دو خانوں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہر حال میں شاعر ہیں، بہر حال زیدی صاحب نے نعتیں بھی خوب کہی ہیں جن سے ان کی والہانہ محبت اور کریم آقا سے زبردست نسبت ابھر کر سامنے آتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عشقِ مجازی کی جھلکیاں ان کے شعری مجموعے "برگِ گل شاداب ہے" میں جا بجا بکھری نظر آتی ہیں۔ ان کے نزدیک جب محبوب کی یاد دل و دماغ میں ابھرتی ہے تو محبوب کا حسن اور روپ صدرنگ جلوے بکھیرتا اور نکھرتا دکھائی دیتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

یاد اس کی ابھر ابھر آئے
روپ کیسا نکھر نکھر جائے
[2]

یہ بات دل و دماغ تک ہی نہیں رکتی بلکہ تصور محبوب ایک نور کا روپ دھار کر سویرے کی صورت میں محبّ کے خیالوں اور آنکھوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

خیال میں اسی خوش خواب کا سویرا ہے
جو میری آنکھ میں ہے دل نشین، وہ میرا ہے
[3]

محبوب کی یادیں جب شدت اختیار کر جاتی ہیں تو محبوب جان کا درجہ حاصل کر کے ہر وقت دھیان میں ہی نہیں بلکہ رگ و پے میں سرایت کرتا نظر آتا ہے۔ بقول شاعر:

لمحہ کوئی روز و شب کا ہو، اسی کا دھیان ہے
جو رگ و ریشہ میں اترا ہے وہ میری جان ہے
[4]

ریاض حسین زیدی طویل مدت سے سفرِ شعر پر گامزن ہیں، وہ عمر کے اس آخری حصے میں بھی جواں جذبوں پر مشتمل غزل کی طلسماتی جلوہ نمائی میں مصروف ہیں۔ تغزل کی چاشنی، رمزیت کی خوبی، فکر کی گہرائی، احساس کی لطافت، خیال کی نزاکت، جمالیاتی رعنائی، حرف و صوت کی تاثر پذیری، زمزمہ پردازی اور معنویت کی شگفتگی و تازگی جیسی صفات ان کے اسلوب و آہنگ کی ترجمانی کرتی ہیں۔ امین راحت چغتائی، زیدی صاحب پر غزل کے اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"غزل کا مذکورہ لہجہ اپنی جگہ لیکن کیا کیا جائے، یہ ایسی ظالم صنفِ سخن ہے کہ جس پر مرتی ہے، اسے مار رکھتی ہے۔ پروفیسر زیدی لاکھ عبا میں ملبوس نظر آئیں وصالِ یار کے لمحے کو حصارِ قریہ جاں میں سجا کر رکھنا نہیں بھولتے۔ چاند سے چہرے اور روزن و دیوار کا تصور اب بھی قلب و جان کو اتھل پتھل کرتا رہتا ہے"۔ [5]

کسی بھی شاعر کے کلام میں سہل ممتنع کا استعمال ایک عمدہ خوبی ہے کیوں کہ بڑے بڑے موضوعات اور بڑی بڑی باتوں کو چند موزوں الفاظ میں بیان کر دینا کسی معرکے سے کم نہیں۔ چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں ایک واضح اور مکمل مفہوم کو گرفت میں لانا یقیناً

غیر معمولی بات ہے۔ سہل ممتنع کا بہترین استعمال ہمیں سید ریاض حسین زیدی کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ پر غموں کی بدولت زندگی کے الجھاؤ کے متعلق استفہامیہ انداز اپناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اداس ہے حیات کیوں
الجھ گئی ہے بات کیوں
میں تم سے خود نہ کہہ سکا
نہ جانے اپنی بات کیوں

.....

ایک اور جگہ پر بربادی کے خلاف دعائیہ انداز اپناتے ہوئے وصال کی تمنا اور آرزو کرتے دکھائی دیتے ہیں مگر یہاں پر بھی انہوں نے سہل ممتنع کا دامن ہاتھ نہیں چھوڑا۔ لکھتے ہیں:

قلب و جان پر کوئی زوال نہ ہو
اے خدا گھر یہ پائمال نہ ہو
زندہ رہنا ہے دوریوں میں بھی
مر نہ جائیں اگر وصال نہ ہو

۶

سید ریاض حسین زیدی کا لب ولہجہ رجائی ہے۔ وہ ہمیشہ ہمت اور حوصلے کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ جس طرح بقول شخصے کہ "اگر سب کچھ کھونے کے باوجود بھی آپ کے اندر ہمت اور حوصلہ باقی ہے تو آپ سمجھ لیں کہ ابھی آپ نے کچھ نہیں کھویا" جدت پسند تخلیق کار ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ تاریکیوں کو اجالوں اور مایوسیوں کو امیدوں میں تبدیل کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

نیا زمانہ، نئی داستاں کی بات کریں
عبث ہے صبح و مسا رفتگاں کی بات کریں
ریاض دل کے اندھیروں کا بھی مداوا ہو
چمکتے جگنوؤں کی، کہکشاں کی بات کریں

۷

وہ چاہتے ہیں کہ ہر طرف نہ صرف تاریکی ختم ہو جائے بلکہ لوگ روشنیوں کے سفیر بن کر راہِ روشن پہ ڈٹ جائیں، حتیٰ کہ من کی دنیا روشن کر کے تن کی کثافت ختم کر ڈالیں۔ سہل ممتنع کے انداز میں وہ رقم طراز ہیں:

راستے تیرگی سے کٹ جائیں
راہِ روشن پہ لوگ ڈٹ جائیں
من کی دنیا میں روشنی کر دیں
تن کثافت سے جب کہ اٹ جائیں

۸

جدید غزل نے زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اسلوب کی تازگی، فکر و آہنگ اور اپنے زمانے کے معاشرتی رویوں کو داخلی اور خارجی تجربات کی تفہیم میں غزل کے علامتی اندازِ بیاں، جمالیاتی حسیات پر مشتمل شاعری اکثر اوقات ترسیلِ معنی اور ابلاغ میں مشکل کا باعث بنتی ہے لیکن زیدی صاحب کے ہاں اس کے برعکس ابلاغ کا مسئلہ نہیں رہتا۔ اس سلسلے میں خالد علیم لکھتے ہیں:

"چناں چہ عمومی زاویہ نگاہ میں وہی شعر پسندیدہ قرار دیا جاتا ہے جو براہِ راست ابلاغ میں حارج نہ ہو اور موزونیت کی خوبی کے ساتھ تفہیم میں آسان تر ہو۔۔۔ اس لیے زیدی صاحب کی غزل علامتی اندازِ اظہار سے بے نیاز اور معنوی لحاظ سے سادہ و سہل مفاہیم کے ساتھ اثر پذیر ہے"۔ ۹

سید ریاض حسین زیدی نے ادب اور ادیب کے ساتھ اپنی وابستگی ہمیشہ برقرار رکھی ہے۔ جس کی سب سے بڑی مثال

''ادب سرائے'' ہے، جو محض نام ہی نہیں بلکہ ایک دبستان کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ایک طویل مدت سے ادب سے محبت کرنے والے وہاں سے سیراب ہو رہے ہیں۔ مولوی عبدالحق کی طرح زیدی صاحب نے بھی ادب کو ہی تقریباً نصف صدی سے اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا رکھا ہے۔ راقم کے خیال میں ان کی فنی و فکری پختگی کے پیچھے ان کی عمر بھر کی ریاضت اور مشقِ سخن کا عمل کارفرما ہے۔ ساہیوال میں علم و ادب کی شمع فروزاں کرنے کے لیے ان کی کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے ان کی قیام گاہ ''ادب سرائے'' پر ماہانہ ادبی نشستوں کا انعقاد ان کی والہانہ ادبی وابستگی پر دال ہے۔ ادب سرائے اور ان کی ادب سے محبت کے حوالے سے جناب واجد امیر لکھتے ہیں:

''جناب ریاض حسین زیدی عرصہ دراز سے ساہیوال جیسے سرد خیز خطے میں علم و ادب کی شمعیں روشن کیے ہوئے ہیں۔ ادب سرائے فقط تنظیم نہیں بلکہ ایک ادارہ ہے، جہاں تشنگانِ علم و فن اپنی رگِ خشک سیراب کرتے ہیں۔ نہ جانے کتنے نو آموزانِ سخن اس ادارے سے اپنی ذہنی اور فنی اصطلاح کر کے منزلوں کے سفر پر رواں دواں ہیں''۔ [10]

''برگِ گل شاداب ہے'' کے حوالے سے ایک ممتاز اور منفرد بات مذکورہ شعری مجموعے کی غزلیات ہیں جو تمام کی تمام کسی نہ کسی عزیز دوست، قدر شناس اور اہم شخصیت سے منسوب ہیں اور یہ تمام نذرانے ان کی اپنی محبتوں کے غماز اور ان کے جذبہ دل کے عکاس ہیں۔ وہ ہوا و حرص سے بے نیاز محبتوں کے امین ہیں، جو وفا کے دیئے جلا کر یاد محبوب کو دل میں بسائے بیٹھے ہیں۔ لکھتے ہیں:

ہوائے حرص سے اس کو بچا کے رکھا ہے
حریمِ یاد کو دل میں بسا کے رکھا ہے
جفا کے پھیلتے سایوں کی میں خبر لوں گا
دیا وفا کا جو میں نے جلا کے رکھا ہے [11]

حوالہ جات

۱۔ واصف سجاد۔ ''سخن کیا کہہ نہیں سکتے'' لاہور، نستعلیق مطبوعات ۲۰۱۳ء ص:۱۸

۲۔ سید ریاض حسین زیدی۔ ''برگِ گل شاداب ہے'' لاہور، الاشراق پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء ص:۵۰

۳۔ ایضاً ص:۹۳

۴۔ ایضاً ص:۱۳۸

۵۔ امین راحت چغتائی۔ مضمون ''شاعری کا تہذیبی کردار'' مشمولہ ''برگِ گل شاداب ہے'' از ریاض حسین زیدی لاہور، الاشراق پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء ص:۲۰

۶۔ سید ریاض حسین زیدی۔ ''برگِ گل شاداب ہے'' لاہور، الاشراق پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء ص:۹۰

۷۔ ایضاً ص:۱۲۲

۸۔ ایضاً ص:۱۶۱

۹۔ خالد علیم۔ مضمون۔ ''ایک صاحبِ دل غزل گو'' مشمولہ ''برگِ گل شاداب ہے'' از ریاض حسین زیدی لاہور، الاشراق پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء ص:۲۴

۱۰۔ واجد امیر۔ مضمون ''عجب اسلوب کی کاریگری ہے''۔ مشمولہ ''برگِ گل شاداب ہے'' از ریاض حسین زیدی لاہور، الاشراق پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء ص:۳۰

۱۱۔ ایضاً ص:۷۳

☆☆☆☆☆

روشنیاں بانٹنے والے----سید ریاض حسین زیدی کچھ تاثرات واحساسات

میرے نزدیک شہروں کی پہچان ان کی دیدہ زیب عمارات سے نہیں بلکہ ان میں سانس لیتے ان انسانوں سے ہوتی ہے جو اس کی تہذیب وثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں اور نہ صرف اپنے عہد بلکہ آنے والا وقت بھی ان کے فکر وفن اور شخصیت کے انمٹ نقوش اپنے دامن میں لیے ہوئے ہوتا ہے - پروفیسر سید ریاض حسین زیدی ایسی ہی فیضان رساں ہستی کا نام ہے جن کے افکار نے ان کے عہد کو بھی منور کیا ہے اور آنے والے ماہ وسال بھی علم وادب کے میدان میں ان کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کریں گے - شہرِ غزل ساہیوال کا ذکر چھڑے یا کوئی علم وادب کی پیاس لیے اس قریے میں وارد ہو تو یہ ممکن ہی نہیں کہ اسے ادب سرائے کا پُرسکون ٹھکانہ نصیب نہ ہو جی ہاں ادب سرائے پروفیسر سید ریاض حسین زیدی کے سسر عالمی مبلغ وسیاح سید محمد یعقوب (مرحوم ومغفور) کا لگایا ہوا وہ نخل تھا جسے اس خاندان کے ہر فرد نے زیدی صاحب کی شعر وادب سے محبت کو عبادت سمجھتے ہوئے سینچا اور آج یہ چھتنار درخت ہے جو سینئر ادبا اور شعرا کے اعترافِ فن اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کا کام بغیر شور مچائے کئی برسوں سے کر رہا ہے- اس کے پروگراموں کا ریکارڈ موجود ہے جس پر تحقیقی کام ہو سکتا ہے- شہرِ ساہیوال میں بہت سی علمی وادبی تنظیمیں قائم ہوئیں اور شہر کے ادبی تشخص کی صورت گری میں اپنا فعال کردار ادا کرتی رہیں لیکن جتنے متنوع نوعیت کی تقاریب ادب سرائے کے زیرِ انتظام منعقد ہوئیں وہ فقید المثال ہیں - نعت گوئی کو باقاعدہ فکری تحریک بنانے میں اس تنظیم کا کردار بہت نمایاں ہے- پروفیسر سید ریاض حسین زیدی صاحب کی پوری زندگی علمی اور ادبی سرگرمیوں سے عبارت ہے - ملتان، عارفوالا، ساہیوال آپ جہاں بھی استاد یا منتظمِ اعلیٰ (پرنسپل) کی حیثیت سے تعینات رہے خود بھی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور دوسرے لوگوں کو بھی لکھنے لکھانے کی تحریک دیتے رہے- ڈاکٹر انوار احمد، زیدی صاحب کے شاگردوں میں شامل ہیں - اس حوالے سے وہ استاذ الاساتذہ ہیں- زیدی صاحب کی شاعری پر بات ہو تو ان کی اولین شناخت حبِ نبیؐ سے سرشار ایک ایسے نعت گو کی ہے جس نے

واصف سجاد

سیرتِ پاک کا نور ذہنوں اور دلوں میں یوں منتقل کیا کہ اب نعت گوئی بھی اس شہرِ غزل کا معتبر تعارف بن گیا ہے۔ عشقِ رسولؐ، زیدی صاحب کا خاندانی ورثہ ہے جو مختلف وقتوں میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتا رہا ہے۔ ان کی غزل بھی الگ تیور رکھتی ہے۔ نعت کے چار دیوان اور غزل کا ایک مجموعہ زیدی صاحب کا معاصر ادبی منظر نامے میں مقام و مرتبہ متعین کرنے کے لیے سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی خوش نویسی جناب نفیس رقم کا ورثہ، خوش گلوء وطنِ عزیز کے نامور نعت خوان سید منظور الکونین کا اثرِ دلپذیر اور شعر گوئی پر قدرت سید نفیس الحسینی کا فیضان محسوس ہوتی ہے۔ سید ریاض حسین زیدی زندگی کا ہر لمحہ تخلیق اور غور و فکر میں بسر کرنے کے حامی ہیں اور یہی تحرک ان کے قریب رہنے والوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کی باصلاحیت اور قابل صاحبزادی سیدہ آمنہ ریاض زیدی صاحب کے علمی و ادبی سرمائے کی بجا طور پر وارث کہلانے کی حقدار ہیں کہ اپنے والدِ گرامی کے کلام کی حفاظت، اشاعت اور ادب سرائے کا انتظام و انصرام اب انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ خدا سے ہم سب زیدی صاحب کی درازیٔ عمر کے لیے دعا گو ہیں تا کہ عزم و ہمت کی یہ زندہ مثال نژادِ نو کے دلوں کو گرماتی رہے زیدی صاحب کے فن و شخصیت پر ایم فل کی سطح کے متعدد مقالہ جات تحریر ہو چکے ہیں۔ روشنیاں بانٹنے والی ایسی شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا رہے گا۔ مجید امجد نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا:

کرنوں کے طوفان سے بجرے بھر بھر کر
روشنیاں اس گھاٹ پر ڈھو گئے کیا کیا لوگ
سلامت رہیں ایسے لوگ اور ان کی توانائیاں

☆☆☆☆☆

جناب علی رضا، جناب سید ریاض حسین زیدی، جناب واصف سجاد اور جناب خالق آرزو۔

فخرِ دبستان ___ پروفیسر سید ریاض حسین زیدی

شہرِ غزل ساہیوال کو چھوڑے ہوئے پچیس برس سے زائد کا عرصہ بیت گیا، برق رفتاری سے گذرتا یہ وقت اپنے پیچھے یادگار نقوش چھوڑ گیا، میں جہاں بھی رہا ساہیوال میرے ساتھ ساتھ رہا اس لیے بھی کہ یہ شہر میری جنم بھومی بھی ہے اور ابتدائی تعلیم اور بچپن کا کچھ عرصہ یہاں گزرا، بعد ازاں 1992 میں ایک بار پھر اس شہر میں ٹھکانہ کیا اس بار میٹرک مکمل ہونے کے بعد کالج داخلے کا مرحلہ آن پہنچا اور انتخاب گورنمنٹ کالج ساہیوال کا ہوا جہاں میرے والد گرامی پروفیسر شوکت علی چوہدری پہلے بطور طالب علم اور بعد ازاں شعبہ انگریزی میں تدریسی خدمات سرانجام دے چکے تھے، سال اوّل میں میرا داخلہ ہو چکا تھا کالج پہنچتے ہی سرخ گلابوں کی خوشبو نے استقبال جن کہ مہک کلاس روم تک بھی محسوس کی جا سکتی تھی وسیع و عریض کھیل کے میدان، گھنے درختوں کی چھاؤں، خوشگوار فضا اور کالج کی راہداریوں سے گزرتے ہوئے نظم وضبط کا ماحول وہاں سے گزرنے والے پر اپنا اثر چھوڑ جاتا، ابھی چند دن گزرے تو ایک دن نوٹس بورڈ پر کسی ادبی تقریب کے حوالے ہاتھ لکھی ہوئی خوشخط تحریر پڑھی، شعر و ادب سے دلچسپی مجھے اس ہال میں لے پہنچی جہاں یہ ادبی تقریب جاری تھی تقریب ختم ہوئی تو میری ملاقات انتہائی شفیق، خوش مزاج، باغ و بہار شخصیت پروفیسر سید ریاض حسین زیدی سے ہوئی جو عارف والہ کالج میں کچھ عرصہ پرنسپل رہنے کے بعد شعبہ اردو سے وابستہ ہو چکے تھے، (بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ خوشخط نوٹس بورڈ والی تحریر پروفیسر زیدی صاحب کے ہاتھ کی تھی) آپ فن خطاطی میں بھی کمال مہارت رکھتے ہیں اس ملاقات میں شعر و ادب سے اپنی دلچسپی بارے انکو آگاہ کیا تو انہوں نے کمال محبت سے حوصلہ افزا فرمائی کچھ وقت گزرا تو انہوں نے مجھے کالج کے ادبی حلقے کا سیکرٹری اور کالج میگزین میں نائب مدیر مقرر کر دیا ساتھ ہی نیوز لیٹر کالج گزٹ کی شعبہ ادارت میں شامل کر دیا، مجھے ان کا مزاج اپنے دیگر اساتذہ سے مختلف لگا وہ جب بھی ملتے پرتپاک ہو کر ملتے پڑھنے لکھنے کی تاکید کرتے، میں نے اس دور میں انہیں تدریس و تالیف کے علاوہ شعر و ادب کے حوالے سے خدمات میں مصروف و متحرک پایا یہی وجہ تھی کہ اس دور میں اس کالج میں برصغیر پاک و ہند سے معروف ادبی شخصیات نے تقریبات میں شرکت کی اور اس اہتمام کا سہرا پروفیسر زیدی کے سر جاتا ہے جو اس دور میں کالج میں یادگار ادبی تقاریب بھی برپا کرتے رہے اور اسی کالج کے تاریخی میگزین ''ساہیوال'' کو بھی بطور چیف ایڈیٹر شائع کرتے رہے اور اپنی ادارت میں یادگار نمبر شائع کیے جن کی مثال آج تک دی جاتی ہے کہ ایسے یادگار نمبر اس دور کے بعد شائع نہ ہو سکے، اس سلسلے میں سب سے اہم کام کالج کی پچاس سالہ تاریخ کو مرتب کرنا تھا

افتخار شوکت

جسے پروفیسر سید ریاض حسین زیدی نے اس دور کے پرنسپل قمرالزماں خان کی زیر سرپرستی شائع کیا اور یہ گولڈن جوبلی نمبر اپنے دور میں بہت مقبول ہوا میری خوش بختی کہ میں اس میگزین کے شعبہ ادارت میں شامل تھا، پروفیسر سید ریاض حسین زیدی کالج میں تو ادبی خدمات کے حوالے سے انتہائی متحرک تھے لیکن کالج سے باہر اپنے گھر پر بھی اس ادبی خدمت کو جاری رکھا پچیس سال پہلے "ادب سرائے ساہیوال" کی بنیاد رکھ دی جس کے زیر اہتمام آج تک تواتر سے ادبی تقاریب، مشاعروں، نشستوں کا انعقاد کیا جا رہا ہے، سید ریاض حسین زیدی کا شمار عصر حاضر کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے ان کی شعری تخلیقات اس قدر پرتاثیر ہیں کہ جیسے جیسے قاری مطالعہ کرتا جاتا ہے اشعار سیدھا اس کے دل میں اترتے جاتے ہیں اور میری ناقص رائے کے مطابق یہی ایک بڑے تخلیق کار کی پہچان ہوتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں اپنے تجربات، مشاہدات، اور احساسات کو اس انداز میں ضبط تحریر میں لائے کہ قاری بے ساختہ داد و تحسین دیئے بغیر نہ رہ پائے اور یہ محسوس کرے کہ لکھنے والے نے تو اس کے دل کی بات کو ہی شعر کی صورت تحریر کر دیا ہے، زیدی صاحب کی شعری تخلیقات عہد حاضر کی فکری تہذیب کا پرتاثیر اظہار یہ ہے، جو اپنے پڑھنے والے پر تادیر سحر طاری کیے رکھتا ہے، یہ فکری تازگی منفرد اسلوب، روایت و جدت کا جداگانہ امتزاج، شگفتہ مزاج سید ریاض حسین زیدی کی شاعری اور شخصیت کا مستقل حصہ ہیں، ان سے جو ایک بار ملا ان کا ہی ہو رہا، قارئین شعر و ادب کے لئے پروفیسر سید ریاض حسین زیدی کی شعری تخلیقی کائنات اور اس کے اعتراف میں ملنے والے اعزازات کی مختصر تفصیل کچھ یوں ہے:

کتب:

ریاضِ مدحت............2002

صدارتی سیرت ایوارڈ (پرویز مشرف)

جمالِ سید لولاک..........2005

ذکرِ شہِ والا.............2011

صوبائی سیرت ایوارڈ یافتہ (شہباز شریف)

برگِ گل شاداب ہے (مجموعہ غزل) 2013

ریاض مجید ادبی ایوارڈ 2000

حفیظ تائب نعت ایوارڈ 2003

اے رسولِ امیں (زیر طبع)

1994 سے تاحال مسلسل اور لگاتار بلا ناغہ مشاعرے کروانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ادب سرائے کے نام سے تنظیم کے بانی ہیں آن لائن عالمی مشاعرے دوران کرونا بھی کروائے۔

اب ادب سرائے کا ویب اخبار ادب سرائے کے ہی نام سے ان کی بیٹی سیدہ آمنہ ریاض چلا رہی ہے۔

www.adabsaraey.com

وہاں بھی علم وادب کا کام ہو رہا ہے۔

ملک عزیز کے نامور ادبی رسائل و جرائد میں مسلسل چھپنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ جن میں فنون، اوراق، بیاض، الحمرا، ارژنگ، غنیمت، ادب دوست، مدحت نعت، نعت رنگ، قابل ذکر ہیں۔

خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ وہ پروفیسر سید ریاض حسین زیدی کو صحت سلامتی عطا فرمائیں اور ادب سرائے یونہی شاد و آباد رہے آمین۔

☆☆☆☆☆

ذکرِ شہِ والا..... سید ریاض حسین زیدی

سید ریاض حسین زیدی کا ریاض ثنا۔ 'ذکرِ شہِ والا' ہے۔ سید ریاض حسین زیدی وہ خوش قسمت صاحب قلم ہیں جنھیں قدرت نے مدحت مصطفیٰ کے لیے منتخب فرمالیا ہے۔ ان کے گوشتہ اعمال میں تین عدد نعتیہ مجموعوں ''ریاض مدحت'' ''جمال سید لولاک'' اور '' ذکرِ شہِ والا'' کا زرِانمول مندرج ہو چکا ہے۔ قدرت نے انھیں گداز دل سے نوازا ہے۔ وہ کیف وسرور اور سوز کی نعمتوں سے بھی مالا مال ہیں ۔ ترنم اور موسیقیت ان کے خاندان کی پہچان ہے۔ منظور الکونین کے دم قدم سے خوش گلوئی انھیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے۔ ان کی سالہا سال کی محنت شاقہ، برس ہا برس کی ریاضت اور کئی دہائیوں کے عمیق مطالعہ اور مشاہدہ نے انھیں کندن بنا دیا ہے۔ نہایت جید استاد ادبیات اُردو زبان وادب ہونے کی وجہ سے انھیں اردو ادب کی شعری روایت سے قریب ترین ہونے کا موقع بھی ملا ہے۔ آلِ رسول کا فرد ہونے کی وجہ سے ان کی نعت پاک میں ایک خاص قسم کی عقیدت، والہانہ پن اور وارفتگی پائی جاتی ہے۔ ان کی نعت میں ندرت بیان بھی ہے، جدت انداز بھی۔ طرزِ نو بھی ہے، فکرِ جدید بھی۔ شگفتگی بھی ہے شیفتگی بھی۔ وہ شعور ووجدان کے امتزاج سے حسین ترین نعت کہتے ہیں۔ جناب سید ریاض حسین زیدی کا اشہب قلم سرزمین طیبہ پر ہزار بار سجدہ ریز ہو کر اور ہر ذرہ ریگ صحرائے مدینہ کو سرآنکھوں میں لگا لگا کر اور چوم چوم کر قرطاس مدحت پر الفاظ بکھیرتا ہے تو ایک ایک حرف ریاض ثنا کا معطر ومعنبر پھول بن کر مہکنے لگتا ہے اور ایک گلستان مدحت کھلتا چلا جاتا ہے جس سے حرم فکر کی فضا عطر بیز ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ احرام عقیدت باندھ کر حرم مدحت میں فریضہ حج ثنا ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا تازہ مجموعہ ''ذکر شہ والا'' زائر طیبہ ہے اور ان کی سوچ معتمر حرم کعبہ ہے۔ ان کا طائر تخیل عقیدت واحترام سے پرواز کرتا ہوا روضہ رسول کے درختوں پر جا بیٹھتا ہے اور گنبد خضریٰ کو دیکھ دیکھ کر بڑے مترنم وشیریں انداز میں سریلے نغمات مدحت رسول میں گاتا ہے۔ وہ عندلیب ریاض رسول ہیں۔ اور ہمیشہ ریاض الجنہ میں فکری اور تخیلی طور پر تمکن وجانشیں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نام کی نسبت ان کے کلام میں ایک طرفہ چاشنی پیدا کرتی ہے جس میں شیرینی ہے۔ روشنی ہے۔ نکہت ہے۔ طہارت ہے۔ محبت ہے اور عقیدت ہے۔ میں نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی نعتیہ کاوشیں نعت کے ادب عالیہ میں بلند مرتبہ پر فائز ہوں گی۔ اللہ کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ جناب سید ریاض حسین زیدی کی نعتوں کا تازہ گلدستہ ''ذکر شہ والا'' قبول ومنظور فرمائے اور اسے ان کی اُخروی فلاح اور نجات ومغفرت کا ذریعہ بنائے اور یہ گلدستہ عقیدت بارگاہِ رسالت میں بھی قبول ومنظور ہو۔

☆☆☆☆☆

ریاض احمد قادری

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

عالمی مشاعرہ ۱۹۹۲ء رات کو سرکٹ ہاؤس کے وسیع و عریض لان میں عالمی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ لوگوں کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ پندرہ ہزار کے لگ بھگ شائقین جمع ہو گئے۔ روایتی انداز میں ایک بہت بڑی اسٹیج پر شعرا کو بٹھایا گیا۔ حاضرین کے لئے پانی اور کشمیری چائے کا بندوبست کیا گیا۔

شاعروں کے لئے گاؤ تکیے، الائچی خورد، سونف، پان اور کلپسری بھی وافر مقدار میں منگوائی گئی۔ البتہ ایک چھوٹا سا مسئلہ ضرور کھڑا ہو گیا۔ وائیں صاحب تقریر کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ گو اچھے

مقرر تھے لیکن مشاعروں میں حاضرین تقریر سننے کے موڈ میں نہیں ہوتے اس لئے ہوٹنگ شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ساری دنیا سے شاعر آئے تھے پھر اُردو کانفرنس کے شرکا کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مشاعرے سے پہلے ڈی سی ہاؤس میں پانچ سو معززین کے ڈنر کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وزیراعلیٰ اور جنرل حمید گل بھی موجود تھے۔

سٹیج پر روسٹرم رکھا جا چکا تھا۔ اگر سامعین نہیں تو مدعوئین یقیناً مہمان خصوصی کے کلمات سننا چاہتے تھے۔ وائیں صاحب کہنے لگے ''کیا یہ بہتر نہیں کہ تقریروں کو گول کر دیا جائے؟''

مجھے حیرانی ہوئی ''اس سے کچھ اچھا تاثر قائم نہیں ہوگا۔ آپ مختصر الفاظ میں مہمانوں کو خوش آمدید کہہ دیں۔''

''جیسے تمہاری مرضی'' انہوں نے بادل نخواستہ حامی بھر لی۔

وائیں صاحب سے پہلے مجھے حرف سپاس کہنا تھا کیونکہ میں میزبان تھا۔ مجھے بھی وائیں صاحب کی طرح تشویش لاحق ہو رہی تھی کہ کہیں ہوٹ نہ ہو جاؤں۔ سامعین میں کافی غیر سنجیدہ اور غیر ذمہ دار لوگ بھی آ جاتے ہیں جن کا مقصد ہی شور وغل اور موج میلہ ہوتا ہے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ملتانیوں کو ان کی اپنی وکٹ پر کھلایا جائے۔ چنانچہ میں نے اپنی تقریر کے تانے بانے کچھ اس طرح بنے۔

''معزز حاضرین! ہم نے آج کے اس مشاعرے میں دنیا بھر سے شاعروں کو بلایا ہے۔ جب دعوت نامے بھیجے تو ناروے سے ہمارے ایک دوست شاعر نے آنے سے انکار کر دیا۔'' لوگوں کو پہلا جھٹکا لگا۔ وہ کون سا گستاخ شاعر ہے جو مدینۃ الاولیا میں آنے سے گریزاں ہے۔ یہی میں چاہتا تھا۔

Shock effect پوچھا ''وجہ؟'' تو بولا ''سنا ہے کہ چار چیزیں تحفہ ملتان گردانی جاتی ہیں۔ گور، گرد، گرما اور گدا گر۔ اگر یہ تحفے ہیں تو پھر شہر اور اس کے باسی کیسے ہوں گے۔''

دوسرا صدمہ۔ شور وغل کرتا ہوا مجمع ایک دم خاموش ہو گیا۔ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھنا اور اپنے گریبانوں میں جھانکنا شروع کر دیا۔ ''تم بے دھڑک آ جاؤ کیونکہ اب ان الفاظ کے معانی اور مفاہیم بدل گئے ہیں۔'' سارے مجمع میں ایک تجسس پیدا ہوا۔

کیا مٹی اور قبروں کے معانی بھی بدل سکتے ہیں۔ گداگر کے چیتھڑوں پر کمخواب ٹانکا جا سکتا ہے، غضب کی پڑتی ہوئی گرمی کو اسم اعظم سے ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے۔

''میں نے اس شاعر کو بتایا'' میں اپنی بات

جاری رکھتے ہوئے بولا ''چناب کے پانیوں نے اس دھرتی کو گلزار بنا ڈالا ہے۔ ہر طرف لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں۔ چہچہاتے ہوئے طیور ہیں اور سرسراتے ہوئے پھلوں کے پیڑ ہیں۔ سلطان الاثمار اسی دھرتی کا تحفہ ہے۔ اگر میں آموں کی قسمیں گنوانا شروع کروں تو تمہارا ناروے سے لے کر ملتان تک کا سفر آسانی سے کٹ سکتا ہے۔ آج کل یہاں جو گرمی ہے وہ گرمی بازار ہے۔ گرمی گفتار ہے، گرمی کردار ہے۔ پہلے ایک تالی۔ پھر چند اور بالآخر سارا پنڈال تالیوں کے شور میں ڈوب گیا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ یہاں گداگر ضرور ہیں لیکن وہ گدائے بے حیا نہیں بلکہ گدائے خواجہ کونین ہیں۔ خواجہ کے گداؤں کا رتبہ شاہوں سے کم نہیں ہوتا۔ اگر یقین نہیں آتا تو پوچھو بلال سے۔ کون بلال؟

وہ حبشی زادہ حقیر
فطرت تھی جس کی نور نبوت سے مستنیر

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے

....

حیرت سے لوگوں کے منہ کھل گئے۔ باقی رہیں قبریں تو وہ کہاں نہیں ہیں۔ مرگ و زیست برحق ہیں جس نے یہاں آنا ہے اس نے ایک نہ ایک دن جانا بھی ہے لیکن اس آنے جانے میں بڑا فرق ہے۔ ایک وہ ہیں جو آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ آئے کب تھے اور گئے کدھر ہیں۔ جھونکا ہوا کا تھا، آیا گزر گیا۔ دوسرے وہ ہیں جو چلے تو جاتے ہیں لیکن بوجوہ ناگوار یادیں چھوڑ جاتے ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو جا کر بھی نہیں جاتے۔ ان کی یاد کی خوشبو ہر گھڑی، ہر لحظہ، مشامِ جاں کو تروتازہ رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے ملتان کو مدینۃ الاولیا کہا جاتا ہے۔ خواجہ بہاؤالدین زکریا، شاہ رکن عالم، شاہ شمس سبزواری اور موسیٰ پاک شہید کے مزار مرجع خلائق ہیں۔ وہ ناروے والا شاعر سر کے بل چل کر یہاں پہنچا ہے۔

مجھے زیادہ خوشی تعریف کی نہیں بلکہ پندرہ ہزار کے مجمعے سے صاف بچ نکلنے کی تھی۔ البتہ گھبراہٹ کی وجہ دوسری تھی۔ وائیں صاحب کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ گو ماحول خاصا سازگار بنا دیا گیا تھا لیکن بتقاضائے بشریت قریہ قریہ کو کریہ کہہ بیٹھے۔ انہوں نے جلدی میں تقریر ختم کی تو مجھے پسینہ آ گیا۔ صبح میری گوشمالی ہونا لازمی امر تھا۔ ان کی چھٹی حس انہیں تقریر نہ کرنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

مشاعرہ ہر طرح سے کامیاب رہا۔ پاکستانی شاعر تو بہت اچھے تھے لیکن وہ لوٹنے والی بات ہندوستان کے حصے میں آئی۔

ہندوستان سے آئی ہوئی ایک شاعرہ نے جب آواز کا جادو جگایا تو ''اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک'' کے معانی سمجھ میں آ گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے لتا جی نے گائیکی چھوڑ کر شعر و شاعری میں دل لگا لیا ہے۔

مزاحیہ شاعر نے بھی لوگوں کو ہنسا ہنسا کر لوٹن کبوتر بنا دیا۔ وہ لفظوں کے ساتھ ایکٹنگ بھی کرتا تھا۔ لوگوں کے لئے یہ نئی بات تھی۔ اس سے پہلے بھی صاحب سلام اللہ کے ڈیرے ارے رے رے، ارے رے رے، ارے رے قسم کے شاعر گزرے ہیں لیکن دور حاضر کے مزاح گوؤں کا انداز الگ اور منفرد ہے۔ اس وقت ایکٹنگ شغلاً کی جاتی تھی اب پیشہ بن چکی ہے۔

اس مزاحیہ شاعر کے بعد انور مسعود کو بلایا گیا تو پتہ نہیں چلتا تھا کہ سامعین کو ہنسا رہے ہیں یا خود رو رہے ہیں۔ مزاحیہ شاعری کے بعد سنجیدہ غزلیں پڑھنے والوں کو دقت پیش آتی ہے لیکن بسا اوقات ایک مزاحیہ شاعر کے بعد دوسرے کا مزاح بھی سنجیدہ سنجیدہ سا لگتا ہے۔ عبیر ابوذری اور سید ضمیر جعفری البتہ کامیاب رہے۔ ایک تو درمیان میں وقفہ آ گیا تھا، دوسرا ان کا مزاح بھی اپنی نوعیت کا تھا۔ بابے عبیر کو تو دیکھ کر ہی ہنسی آ جاتی۔ لمبی داڑھی، ڈھلتی ہوئی عمر۔ ان کی شاعری اُردو اور پنجابی کا ملغوبہ ہوتی۔ چونکہ باری رات کو دو بجے کے قریب آئی اس لئے اکثر گلہ کرتے ہوئے کہتے ''شاہ صاحب! جب ہمارے کھانسنے کا وقت ہوتا ہے تو آپ ہم سے شعر پڑھواتے ہیں۔ ہر مشاعرے میں لوگ ان سے پولیس والی غزل ضرور سنتے۔

پولس نوں آکھاں رشوت خور تے فیدا کی
پچھوں کردا پھراں ٹکور تے فیدا کی
جھاڑو نال بناواں مور تے فیدا کی
بوتھی ہو جائے ہور دی ہور تے فیدا کی

....

آج اگر شیکسپیئر پنجاب میں ہوتا تو ''بوتھی ہو جائے ہور دی ہور تے فیدا کی؟'' کو انجوائے تو کرتا لیکن اس کا انگریزی میں ترجمہ نہ کر پاتا۔ ہر زبان کے اپنے **Nuances** ہوتے ہیں، جن کا ترجمہ کرنے سے شعر کا سارا لطف جاتا رہتا ہے اور یونانی مقولے کے مطابق بالکل **Roasted Straw Berry** کا سا ذائقہ لگتا ہے۔

کسی زمانے میں مشہور تھا کہ ایک فوجی شاعر کا لب و لہجہ بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے جس طرح پٹھان پتنگ بیچتا ہے۔ سید ضمیر جعفری نے اسے غلط کر دکھایا۔ ان کے مزاح میں بھی ایک فکر نمایاں نظر آتی۔ ترنم سے پڑھتے تو عمر کی وجہ سے آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا تھا بایں ہمہ لوگ ان کے کلام سے لطف اندوز ہوتے۔

انگریز شاعر کی مشہور نظم کا ترجمہ انہوں نے اپنے انداز میں کیا۔ وہ لندن کی ہائی سوسائٹی

کی ایک میڈم کا قصہ تھا جس کی چوکھٹ پر ہر کوئی سجدہ ریز ہوتا۔ ترجمہ کرتے ہوئے انہوں نے اس میں بارہ دیسی مسالوں کی چاٹ لگا دی۔ اکثر کہتے گو یہ میری نظم نہیں ہے لیکن اب اس کی بھی نہیں رہی۔

ضمیر جعفری کی حس مزاح بڑی تیز تھی۔ ''تیری کرنیلی بھی گئی، میری کپتانی بھی گئی'' لکھ کر حفیظ جالندھری کی کرنیلی کو کان نمک بنا دیا تھا۔ نثر بھی بڑی خوبصورت لکھتے۔ آسٹریلیا پر لکھی گئی میری کتاب ''سلگتے ساحل'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ''ہم نے تو صرف آسٹریلیا دیکھا ہے، شاہ صاحب نے اسے برتا بھی ہے۔'' مجھے یہ ایک جملہ اپنی ساری کتاب پر بھاری لگا۔ بے شمار واقعات جو میں بوجوہ بیان نہ کر سکتا تھا، وہ قبلہ نے ''بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی'' کہہ کر افشا کر دیے۔

مشاعرہ صبح کو اختتام پذیر ہوا۔ اہل ملتان نے اس سے پہلے اس سطح کا مشاعرہ نہ سنا تھا۔ مشاعرہ ختم ہوا تو منو بھائی کہنے لگے ''شاہ صاحب! مغلوں کے زمانے میں مشہور تھا کہ جس کا ملتان مضبوط ہے اس کا دلی مضبوط ہے۔ فی زمانہ جو شخص ملتان مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ لاہور کمزور کر بیٹھتا ہے۔ میں نے صبح آپ کی تقریر سنی ہے۔ مشاعرے کے واقعات بھی پیش نظر ہیں۔ وزیر اعلیٰ کیسا ہی درویش منش کیوں نہ ہو، وزیر اعلیٰ ہوتا ہے اور نازک مزاج شاہاں تاب سخن نہ دارند۔ آپ بوریا بستر باندھ لیں۔

وزیر اعلیٰ نے شاید اتنا محسوس نہ کیا لیکن اگلے دن جب اخبار میں خبر چھپی تو سیکرٹریٹ میں ایک بھونچال آ گیا۔ کئی جبینیں شکن آلود ہوئیں۔ ارباب اختیار نے تیوریاں چڑھائیں۔ آ گئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا۔ چیف سیکرٹری پرویز مسعود نے میری جواب طلبی کر لی کہ میں نے وزیر اعلیٰ کی شان میں گستاخی کیوں کی ہے۔ وہ مجھ سے براہ راست کم ہی مخاطب ہوتے۔ اس دفعہ بھی انہوں نے کمشنر کے ذریعے مجھ سے جواب مانگا۔ اب میں انہیں کیا جواب دیتا۔ ایک چٹ پر یہ شعر لکھ کر بھجوا دیا:

یہ دل جو قحط انا سے غریب ٹھہرا ہے
میری زباں کو زرِ التماس کیا دے گا

.....

اہل ملتان نے البتہ خوب حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے ایک تقریب منعقد کر کے مجھے محسن ملتان کا خطاب دیا۔ محبت کے پھولوں میں رقابت کے خار ہمیشہ سے چلے آئے ہیں۔ ایک شخص جو مجھے مسلسل زچ کر رہا تھا وہ فرنٹیئر پوسٹ کا بیورو چیف عارف مظہر تھا۔ وہ سرائیکی تحریک کا غیر علانیہ علمبردار تھا۔ کانفرنس سے قبل میرے پاس آیا اور سمجھانے کی کوشش کی کہ

سرائیکی بیلٹ میں اُردو کو پروموٹ کرنے کی کوشش نہ کروں۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ میرا بھی کسی نہ کسی حد تک تعلق اس زبان سے بنتا ہے۔ اس قسم کے اقدامات سے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ میں اسے کیا سمجھاتا اُلٹا مجھے دھمکی دے گیا۔ ''پھر گلہ نہ کرنا'' اس نے علائے دین کو بھڑکانے کی کوشش کی۔ مسلسل منفی خبریں چھاپ کر لوگوں کو برگشتہ کرنے کا بیڑہ اُٹھایا۔ جب بھی میں اس قسم کی بے سروپا خبروں پر احتجاج کرتا، اُس کا ایک ہی جواب ہوتا۔ آپ ایک صحافی کو اس کی صحافیانہ ذمہ داریوں سے نہیں روک سکتے۔ ایک دن تو اس نے حد کر دی۔ فرنٹیر پوسٹ کے پہلے صفحہ پر جلی حروف میں خبر چھپی۔ ملتان میں امن عامہ کی حالت خطرناک حد تک بگڑ چکی ہے۔

وجہ؟ پولیس اور مجسٹریسی ڈی سی کو کامیاب کانفرنس پر مبارک باد دینے میں لگی ہوئی ہے اور ٹھیک طرح سے چور اچکوں، راہزنوں اور اٹھائی گیروں پر توجہ نہیں دے پا رہی۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ میں نے سوچا Enough is Enough۔ ایک دن انتظار قریشی کی سرکردگی میں جلوس نکلا۔ ہزار آدمیوں نے رحمت شاہ آفریدی کا پتلا اُٹھا رکھا تھا جس کے ہاتھوں میں ''بہت کچھ'' تھا۔ گھنٹہ گھر جا کر انہوں نے اخبار کی سب کاپیاں جلا ڈالیں اور جوتوں سے آگ بجھائی۔ راستے میں عارف مظہر کا دفتر آتا تھا اس کی بھی مزاج پرسی کی۔ اتفاق سے میں اس دن لاہور گیا ہوا تھا۔ جب شام کو واپس آیا تو کمشنر صاحب حسب دستور مضطرب تھے۔ کہنے لگے ''اوہ شاہ تم نے یہ کیا کر ڈالا ہے۔ تم نے عارف مظہر کو جوتے مروائے ہیں۔ اخبار کے خلاف جلوس نکلوایا ہے، خود غائب ہو گئے ہو۔ ایسی کون سی ضروری میٹنگ تھی جو لاہور جانا پڑا۔ یہ تو محض ایک سموک اسکرین تھا۔ چیف سیکرٹری بڑا بیخ پا ہے۔ کہتا ہے ''اگر تم اس ڈی سی کو ٹھیک نہیں کر سکتے تو میں اس کا مزاج درست کر دوں گا۔ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے، پھنے خان کہیں کا! ساری حکومت کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔''

''وہ مجھ سے ڈائریکٹ بات کیوں نہیں کرتا؟ اگر وہ یا آپ میرا مزاج درست کر سکتے ہیں تو کر دیکھیں۔ مجھے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟''

رانا صاحب سمندر کی جھاگ کی طرح بیٹھ گئے اور اپنا مخصوص جملہ دہرایا ''اوئے شاہ! مینوں کڈھ! (مجھے اس مشکل صورت حال سے باہر نکالو) میں اسے کیا جواب دوں کہ تم نے اخبار کے خلاف کیوں جلوس نکلوایا ہے؟''

کہہ دیں کہ اخبار میاں نواز شریف کی

حکومت کے خلاف مسلسل ہرزہ سرائی کر رہا تھا اس لئے راست اقدام ضروری تھا۔ جب رانا صاحب نے چیف سیکرٹری کو میرا پیغام پہنچایا تو اس پر بھی سکتہ طاری ہو گیا۔ کہنے لگا

"That is the usual excuse"

میں نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اخبار کو ہتک عزت کے ضمن میں ایک کروڑ روپے ہرجانے کا نوٹس بھجوا دیا۔

ایک دن چیف سیکرٹری کا فون آ گیا۔ خاصے خوشگوار موڈ میں لگتے تھے۔ کہنے لگے

"اوئے! توں انہاں نو معاف نہیں کریں گا؟"

عرض کیا "سر! آپ بغیر بات سنے نتائج اخذ کر لیتے ہیں جو میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔"

بولے "نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"کہو! میں گوش برآواز ہوں۔"

"کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ آفریدی نے ساری حکومت کو آگے لگایا ہوا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب اس نے طنز و تشنیع کے نشتر نہ چلائے ہوں۔ ایسا خناس آدمی آج آپ کے پاس حاضر ہو کر منت ترلا کر رہا ہے۔ یہ سب میری وجہ سے ہے۔"

خوش ہو کر بولے "بالکل درست کیا ہے۔ اس پہلو کا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا لیکن اب انہیں معاف کر دو اور نوٹس واپس لے لو۔"

عرض کیا "جیسا آپ کا ارشاد۔ لیکن ایک شرط ہے"

"وہ کیا ہے؟"

"Apology from the news paper on the front page"

اخبار نے معذرت کر لی اور میں نے نوٹس واپس لے لیا۔ دراصل اخبار کو نوٹس کی پروا نہ تھی اس قسم کے قانونی نوٹس انہیں ملتے رہتے ہیں اور اخبار کے قانونی مشیران کا توڑ بھی جانتے ہیں۔ گھنٹہ گھر میں اخبار جلانا اور جوتے پڑنا تشویش کی بات تھی۔ انہوں نے عارف مظہر کی جواب طلبی کر لی کہ کیوں نہ اسے نوکری سے فارغ کر دیا جائے یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے ہوا تھا۔

ایک شام عارف مظہر میرے گھر آ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "مجھے معاف کر دیں۔ صحافت کے زعم میں میں پیشہ ورانہ حد کراس کر گیا تھا۔" میں نے اسے گلے لگا لیا۔ صحافی برادری سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہا جا سکتا۔ انتظامیہ تو ان کے ناز نخرے اٹھانے کی ویسے ہی عادی ہوتی ہے۔

جو لوگ سیاست دانوں کی ظاہری سج دھج اور شان و شوکت دیکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ عیش بنا ہی تجمل حسین خاں کے لئے ہے۔ لیلائے اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے جو جنگ و دو کرنا پڑتی ہے اور جس قسم

کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں وہ کوئی نہیں دیکھتا۔ جیسا کہ میکبتھ نے کہا تھا شاہی کی حفاظت بھی ضروری ہوتی ہے۔ ہر وقت چوکس رہنا پڑتا ہے کہ کون آپ کے خلاف سازش کر رہا ہے، اس سازش کا توڑ کیا ہے، بطور حفظ ماتقدم خود بھی اسی قسم کے چند جال بننا پڑتے ہیں۔ سیاست دان کی سب سے مؤثر خوراک اس کی مقبولیت ہے۔ ایک کامیاب سیاست دان وہ ہے جس کا ہاتھ عوام کی نبض پر ہوتا ہے۔ وہ مقبول اور ہر دلعزیز بننے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ پبلک اوپینین بلڈ کرنے میں کئی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ سب سے مؤثر پریس اور پبلسٹی ہے۔ میاں برادران اس میں ماہر ہیں۔ زرداری مسٹر ٹین پرسنٹ تھا یا نہیں، بے نظیر چشم پوشی کرتی تھی یا شریک تھی، اس کو پریس میں اُچھالنے اور مؤثر پراپیگنڈہ کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ رات دو بجے تک یہ پلاننگ کرتے، کس کا منت ترلا کرنا ہے۔ کس کی خدمت میں لفافہ پیش کرنا ہے اور کس کس کو جوتے مروانے ہیں۔ بعض اوقات اپنی ہی پارٹی کے رکن کی مزاج پرسی بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ سرفراز نواز قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ ہر روز اسمبلی کے اندر اور باہر بیانات داغتا رہتا۔ ایک موٹر پھینٹی نے گھوڑے کے منہ میں لگام اور ناک میں نکیل ڈال دی۔ دولتیاں تو کیا جھاڑنی تھیں بے چارہ، چارہ بھی سونگھ کر کھاتا۔

اس سلسلے میں ملتان کے ایک ٹرانسپورٹر شیخ ظہور کو استعمال کیا گیا۔ وہ ہر ہفتے اخباروں میں لاکھوں روپے کے اشتہار دیتا جس میں نہایت بھونڈے انداز میں میاں نواز شریف کی قائدانہ صلاحیتوں کو اُجاگر کیا جاتا اور قصیدہ خوانی کی جاتی۔ یار لوگ حیران ہوتے کہ اس کے پاس اس قدر زر کثیر کہاں سے آ گیا ہے۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ اس کا محض نام استعمال ہوتا ہے۔ رقم اور قصیدے کہیں اور سے لکھے ہوئے آتے۔ وہ ملتان کا ایک نہایت چالاک اور بدنام شخص تھا۔ میاں صاحب سے اپنا خاص تعلق ظاہر کرتا۔ کئی پولیس افسروں کو ترقی کا چکمہ دے کر خاصی رقم بٹور لی۔ ایک ٹوٹی پھوٹی ویگن سے کئی ویگنیں بنالیں اور میونسپل لینڈ پر قبضہ کر کے اڈہ قائم کر لیا۔

ایک دن رات کو بارہ بجے کے قریب ایس ایس پی مرزا محمد علی کا فون آ گیا۔ کہنے لگا ''شیخ ظہور کو ایف آئی اے نے فراڈ کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔ وزیراعظم صاحب سخت ناراض ہیں۔ مجھے حکم دیا ہے کہ ابھی جا کر اس کو آزاد کرواؤ۔ وہ چاہتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ تھانے

جاؤں۔ ایف آئی اے چونکہ مرکز کا محکمہ ہے اس لئے اس پر ایس پی کا محکمانہ کنٹرول نہیں ہوتا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں اسے بھی روکنا چاہتا تھا لیکن پھر سوچا وزیراعظم سے جھاڑ کھا بیٹھا ہے، رو کے بھی نہیں رُکے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد وزیراعظم صاحب کا فون آ گیا۔ سوچا مجھے بھی اس سلسلے میں کوئی ہدایت دیں گے لیکن انہوں نے کسی اور کام کے لئے فون کیا تھا۔ خاصے غصے میں لگتے تھے۔ کہنے لگے "شاہ صاحب! یہ تنویر گیلانی ایم این اے جامے سے باہر نکلتا جا رہا ہے۔ اسمبلی کی لابی میں میرے خلاف ہرزہ سرائی کی ہے۔ اس کو سمجھائیں نہیں تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔" تنویر کو سمجھانے سے قبل میں نے انہیں کچھ بتانے کی کوشش کی۔

"سر! تسلی رکھیں۔ میں اسے راہ راست پر لے آؤں گا۔ بس تھوڑا سا دل و دماغ کے دروازے کھلے رکھیں۔"

اگلے دن میں نے تنویر گیلانی کو فون کیا اور اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ وہ خود آ گیا۔ پتہ چلا کہ اس نے اسمبلی کی لابی میں تمام پارٹی ایم این ایز کی موجودگی میں میاں صاحب کے خلاف خوب دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ غلام اسحاق کی طرف داری کرتے ہوئے نواز شریف کو احسان فراموش کہا۔

گیلانی کہنے لگا "آپ اس شخص کو نہیں جانتے اسے جنوب کے سادات ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ ہم وزارت نہیں مانگتے، عزت نفس کے طلب گار ہیں۔ میں نے ایک شخص کو تعارفی رقعہ دے کر جی ایم سوئی گیس کے پاس بھیجا اس نے رُقعہ پھاڑ دیا۔ چوہدری نثار سے شکایت کی۔ وہ اپنے آپ کو نائب وزیراعظم سمجھتا ہے۔ اس نے بھی گھاس نہ ڈالی۔ واقعہ نواز شریف کے نوٹس میں لے آیا۔ اس نے تسلی کے دو بول بھی نہ بولے۔ ان حالات میں تنقید نہ کرتا تو کیا اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتا۔"

کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ کبھی بھی میاں صاحب کے خلاف نہیں بولے گا۔ یہ بھی طے پایا کہ جب وہ ملتان آئیں گے تو ان کے اعزاز میں ایک ہزار آدمیوں کی چائے پارٹی کرے گا اور سپاس نامے میں انہیں ہدیہ تبریک پیش کرے گا۔ ایک رات کو فون کر کے میں نے وزیراعظم صاحب کو پراگریس رپورٹ دی تو بہت خوش ہوئے اور ایک نہیں دو مرتبہ Well done Shah Sahib. Thank you very much" کہا۔

[جاری ہے۔]

عُتبہ بن رَبیعہ

مکہ میں جب رسولؐ اللہ نے لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچانا شروع کیا اور خدائے واحد کی عبادت کی تلقین کی تو مشرکین کی جانب سے طرح طرح کے الزامات لگائے جانے لگے۔ ان کو یقین نہ آتا تھا کہ ہم میں سے ہی ایک شخص جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہے اس پر اللہ اپنا کلام وحی کرتا ہے۔ وہ سمجھتے کہ شاید آپؐ کو دولت یا سرداری یا بادشاہت کی خواہش ہے - وہ آپ کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے اور قرآن کا پیغام سننے پر بھی آمادہ نہ تھے۔ انھوں نے وطیرہ اختیار کرلیا کہ جب بھی پیغمبر اسلام یا ان کے پیروعام لوگوں کو قرآن سنانے کی کوشش کریں تو فوراً ہنگامہ برپا کردیا جائے اور اتنا شور مچایا جائے کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔ حضورؐ کو اس اندھی اور بہری مخالفت کا سامنا تھا۔

ایک روز قریش کے کچھ سردار مسجد حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے دوسرے گوشے میں رسولؐ اللہ تنہا تشریف رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ دیکھ کر قریش کے لوگ پریشان تھے۔ اس موقع پر عتبہ بن ربیعہ نے، جو ابوسفیان کے خسر تھے۔ سردارانِ قریش سے کہا کہ صاحبو، اگر آپ پسند کریں تو میں جا کر محمدؐ سے بات کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں۔ شاید وہ ان میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کرلیں اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آجائیں۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور عتبہ اٹھ کر نبیؐ کے پاس جا بیٹھا۔ آپؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا ”بھتیجے تم اپنی قوم میں، اپنے نسب اور خاندان کے اعتبار سے جو حیثیت رکھتے ہوئے وہ تمھیں معلوم ہے، مگر تم اپنی قوم پر

پیروز بخت قاضی

ایک بڑی مصیبت لے آئے ہو۔ تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بیوقوف ٹھہرایا۔ قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی برائی کی اور ایسی باتیں کرنے لگے، جن کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب کے باپ دادا کافر تھے۔ اب ذرا میری بات سنو۔ میں کچھ تصویریں تمھارے سامنے رکھتا ہوں۔ ان پر غور کرو۔ شاید کہ ان میں سے کسی کو تم قبول کرلو۔"

رسول اللہ نے فرمایا ابوالولید آپ کہیں، میں سنوں گا۔ اس نے کہا "بھتیجے یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے، اس سے اگر تمھارا مقصد مال حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تم کو اتنا کچھ دیئے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو تمھیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں، کسی معاملہ کا فیصلہ تمھارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں اور اگر تم پر کوئی جن آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو تو ہم بہترین اطباء بلواتے ہیں اور اپنے خرچ پر تمھارا علاج کراتے ہیں۔" عتبہ یہ باتیں کرتا رہا اور حضورؐ خاموش سنتے رہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا ابوالولید آپ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے؟ اس نے کہا "ہاں"۔ آپؐ نے فرمایا اچھا اب میری سنو۔ اس کے بعد آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورۃ حٰمٓ السجدہ (41) کی تلاوت شروع کردی اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ آیت سجدہ (38) پر پہنچ کر آپؐ نے سجدہ کیا، پھر سر اُٹھا کر فرمایا "اے ابوالولید میرا جواب آپ نے سن لیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔" ان آیاتِ قرآنی کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"حٰمٓ، یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا۔ مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں "جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف، چڑھے ہوئے ہیں، ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں، اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے۔ تو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کیے جائیں گے۔" (۴۱: ۱ تا ۵)

اے نبیؐ! ان سے کہو، میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا۔ مجھے وحی کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمھارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے، لہٰذا تم سیدھے اسی کا رُخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو۔ تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر

ہیں۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے مان لیا اور نیک اعمال کیے ان کے لیے یقیناً ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔ (۴۱: ۶ تا ۸)

اے نبیؐ! ان سے کہو، کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے۔ اس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہُوا جو اس وقت محض دُھواں تھا۔ اُس نے آسمان اور زمین سے کہا ''وجود میں آجاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔'' دونوں نے کہا ''ہم آ گئے فرمانبرداروں کی طرح۔'' تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمانِ دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور؟ اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔ (۴۱: ۹ تا ۱۲)

اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہُوا تھا جب خدا کے رسول ان کے پاس آگے اور پیچھے، ہر طرف سے آئے اور انھیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو تو انھوں نے کہا ''ہمارا رب چاہتا تو فرشتہ بھیجتا، لہٰذا اُسے ہم نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔'' (۴۱: ۱۳ تا ۱۴)

عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے ''کون ہے ہم سے زیادہ زور آور۔'' ان سے زیادہ زور آور ہے؟ وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے، آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تا کہ انھیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزا چکھا دیں، اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہے، وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔ رہے ثمود، تو ان کے سامنے ہم نے راہِ راست پیش کی مگر انھوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا بنا رہنا پسند کیا۔ آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور گمراہی و بدعملی سے پرہیز کرتے تھے۔ (۴۱: ۱۵ تا ۱۸)

اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ ان کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا، پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور

ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے ''تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟'' وہ جواب دیں گی ''ہمیں اسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے۔ اسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو۔ تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمھیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمھارے اپنے کان اور تمھاری آنکھیں اور تمھارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی۔ بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمھارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے۔ تمھارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے۔ اس حالت میں وہ صبر کریں (یا نہ کریں) آگ ہی ان کا ٹھکانہ ہو گی اور اگر رجوع کا موقع چاہیں گے تو کوئی موقع انھیں نہ دیا جائے گا۔ ہم نے ان پر ایسے ساتھی مسلط کر دیے تھے جو انھیں آگے اور پیچھے ہر چیز خوشنما بنا کر دکھاتے تھے۔ آخرکار ان پر بھی وہی فیصلہ عذاب چسپاں ہو کر رہا جو ان سے پہلے گزرے ہوئے جنوں اور انسانوں کے گروہوں پر چسپاں ہو چکا تھا۔ یقیناً وہ خسارے میں رہ جانے والے تھے۔

(۴۱: ۱۹ تا ۲۵)

یہ منکرینِ حق کہتے ہیں ''اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو، شاید کہ تم اس طرح غالب آ جاؤ۔ ان کافروں کو ہم سخت عذاب کا مزا چکھا کر رہیں گے اور جو بدترین حرکات یہ کرتے رہے ہیں ان کا پورا پورا بدلہ انھیں دیں گے۔ وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا گھر ہوگا۔ یہ ہے سزا اس جرم کی کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔ وہاں یہ کافر کہیں گے کہ ''اے ہمارے رب، ذرا ہمیں دکھا دے اُن جنوں اور انسانوں کو جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، ہم انھیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں۔'' جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ اور ان سے کہتے ہیں کہ ''نہ ڈرو، نہ غم کرو، اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی، ہاں جو کچھ تم چاہو گے تمھیں ملے گا اور جس چیز کی تم تمنا کرو گے وہ تمھاری ہو گی، یہ ہے سامانِ ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے۔''

(۴۱: ۲۶ تا ۳۲)

اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہو گی جس نے، اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل

کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اے نبیؐ، نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں، اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں جو بڑے نصیبے والے ہیں۔ اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکتاہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو، وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ (۴۱: ۳۳تا۳۶)

عتبہ حضورؐ پاک سے یہ تلاوت سننے کے بعد اُٹھ کر سردارانِ قریش کی مجلس کی طرف چلا تو لوگوں نے دور سے اس کو دیکھتے ہی کہا، خدا کی قسم عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے، یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر یہ گیا تھا۔ پھر جب وہ آ کر بیٹھا تو لوگوں نے کہا "کیا سُن آئے؟" اس نے کہا "بخدا میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا۔ خدا کی قسم نہ یہ شعر ہے، نہ سحر ہے نہ کہانت ہے۔ اے سردارانِ قریش میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام کچھ رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے۔ لیکن اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی تمھاری بادشاہی اور اس کی عزت تمھاری عزت ہوگی۔"

سردارانِ قریش اس کی یہ بات سنتے ہی بول اُٹھے: "ولید کے ابا آخر اس کا جادو تم پر بھی چل گیا۔" عتبہ نے کہا "میری جو رائے تھی وہ میں نے تمھیں بتا دی۔ اب تمھارا جو جی چاہے کرتے رہو۔" (ابن ہشام، جلد ا، ص ۳۱۳، ۳۱۴)

اس قصے کو متعدد دوسرے محدثین نے حضرت جابر بن عبداللہ سے بھی مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے جن میں تھوڑا بہت لفظی اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضورؐ تلاوت کرتے ہوئے آیت نمبر ۱۳ پر پہنچے (ترجمہ: اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمھیں عاد اور ثمود کے عذاب جیسے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں) تو عتبہ نے بے اختیار آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا "خدا کے لیے اپنی قوم پر رحم کرو۔" بعد میں اس نے سردارانِ قریش کے سامنے اپنے اس فعل کی وجہ یہ بیان کی کہ "آپ جانتے ہیں محمدؐ کی زبان سے جو بات نکلتی ہے پوری ہو کر رہتی ہے۔ اس لیے میں ڈر گیا کہ کہیں ہم پر عذاب نازل نہ ہو جائے۔" (تفسیر ابن کثیر، جلد ۴، صفحہ ۹۰-۹۱)

☆☆☆☆☆

ہر اک خواہش پہ دم نکلے

شیما اور کریم دونوں ایکدوسرے سے یکسر مختلف تھے--- کریم 27 برس کا معمولی شکل و صورت کا دبلا پتلا نوجوان تھا--- جبکہ شیما--- چھوٹے قد فربہی مائل بدن والی قبول صورت خاتون تھی--- عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی---

دونوں کا تعلق افغانستان سے تھا---اور دونوں میاں بیوی تھے۔

شیما لمبی جیکٹ پہنے سر پر سکارف لیے ہوتی اور اپنے چہرے کو آدھا ڈھانپ کر رکھتی۔

یہ دونوں میرے گھر کے ساتھ والے فلیٹ میں مقیم تھے---

دونوں ایک طویل سفر کی صعوبتیں کاٹ کر سویڈن پہنچے تھے۔

شیما کا خاندان امریکی جنگ کے دوران افغانستان سے ہجرت کر کے ایران گیا تھا--- جبکہ کریم کا خاندان بھی افغانی مہاجر تھا۔

شیما اپنے شوہر اور دو بچوں اور والدہ کے ساتھ مہاجر کیمپ میں رہتی تھی---

اس کا شوہر افغانستان دوبارہ گیا تو واپس نہیں آیا---اس کے دونوں بیٹے بڑے ہو رہے تھے--- شیما کو ان کے مستقبل کی فکر تھی---وہ چاہتی تھی کہ اس کے بچے اچھی زندگی گزاریں - -اور انھیں ایران کے مہاجر کیمپ سے نکال کر یورپ کے کسی اچھے ملک میں لے جائے--- تاکہ ان کی اگلی زندگی عیش و آرام اور امن کے سائے میں گزرے---

تلاش بسیار کے بعد اس نے ایک ایجنٹ تک رسائی حاصل کر لی جو اسے یونان اور پھر سویڈن پہنچا سکتا تھا---وہ چاہتی تھی کہ اس کے بچے جو ابھی اٹھارہ برس سے کم عمر تھے ان کو بھی ساتھ لے جائے--- مگر اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کی وہ تین افراد کا خرچہ ایجنٹ کو دے سکتی---

بہت سوچ بچار اور والدہ سے مشورے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پہلے خود یورپ

نیلما ناہید درانی

جا کر وہاں کی نیشنلٹی حاصل کرے گی اور بعد میں اپنی والدہ اور بچوں کو بھی وہاں بلا لے گی۔۔

ایجنٹ نے بتایا تھا کہ یورپ کے بہت سے ممالک افغان مہاجرین کو مستقل رہنے کی اجازت دے رہے ہیں۔

ثیما نے اپنی جمع پونجی ایجنٹ کے حوالے کی اور اپنے اور اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی آس لے کر مہاجر کیمپ سے نکل کر ایجنٹ کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئی۔

ایران کے ساحل سمندر کے قریب کچھ دن اسے ایک عمارت میں رہنا پڑا جس میں کئی مرد پہلے سے موجود تھے۔۔ جو اس سفر پر اس کے ساتھ روانہ ہونے والے تھے۔۔

آخر کار ایجنٹ نے لانچ کے آنے کی نوید دی۔۔ جب وہ لانچ میں سوار ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ اس سفر پر جانے والی وہ واحد خاتون تھی۔

ثیما خوفزدہ ہو گئی۔۔ اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئی۔۔

وہیں اس کی ملاقات کریم سے ہوئی۔۔ کریم نے اس کے قریب آ کر اس سے بات کرنی شروع کی اس کو خوفزدہ دیکھ کر اس کا حوصلہ بڑھایا۔۔ اور کہا کہ میں لانچ کے سب افراد کو بتا دوں گا کہ تم میری بیوی ہو۔۔ پھر کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔۔ کریم اس کا بہت خیال رکھتا۔۔ اس کو کھانا، پانی، چائے لا کر دیتا۔۔۔ اس کا دل بہلانے کے لیے اس کو اپنے بچپن کی کہانیاں سناتا۔۔۔

لانچ کا یہ سفر جب اسے خوفزدہ کرتا تو کریم افغانی لوک گیت گا کر اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کرتا۔

رات کے سناٹے میں چاروں طرف پانی ہی پانی۔۔ اور پانی کا شور تھا جیسے ہر طرف آسیب ناچ رہے ہوں۔

کبھی کبھی جب لانچ ہچکولے کھاتی تو سب کو موت قریب آتی دکھائی دیتی۔۔۔ کچھ تو رونے لگتے اور سب مل کر بلند آواز میں قرآنی آیات کا ورد کرنے لگتے۔

خدا خدا کر کے لانچ کا سفر ختم ہوا۔۔

اور ڈوب کر مرنے کے خوف سے نجات ملی۔

اب وہ ایک جنگل میں تھے۔۔ جہاں انھوں نے میلوں پیدل چلنا تھا۔۔

یہاں سکیورٹی والوں کا خوف تھا۔۔ جو بغیر پوچھے گولی چلا دیتے تھے۔

وہ سب دن بھر درختوں میں چھپے رہتے اور رات کے وقت پیدل چلتے۔

کئی دن اور راتیں اسی طرح گزریں۔۔ ان کے پاؤں شل ہو چکے تھے۔۔ کھانے پینے کی اشیاء ختم ہو رہی تھیں۔۔ مگر اک آس نے حوصلہ دے رکھا تھا۔ کہ اب وہ یورپ کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں۔۔ اور یونان

کا شہر ایتھنز تھوڑی دور کی مسافت پر ہے۔
ان کے کئی ساتھی تھک کر ایسے بیٹھے کہ پھر اٹھ نہ سکے۔۔ جو باقی تھے انھوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔۔
آخر کار انھیں شہر کی بتیاں دکھائی دیں۔۔ تو انھیں زندگی کی نوید نظر آئی۔
ایتھنز میں پہنچتے ہی ایجنٹ کے کارکن ان کو لینے آ گئے اب انھیں ایک وین میں بند کر کے۔۔ ایک گھر کی بیسمنٹ میں پہنچا دیا گیا۔۔ جس میں حبس اور بدبو تھی۔۔ لگتا تھا ان سے پہلے جو لوگ وہاں رہ کر گئے تھے انھوں نے جاتے ہوئے صفائی تک نہیں کی تھی۔
ایجنٹ کے ساتھی نے انھیں آرام کرنے کا کہا۔ اور ان کے لیے کھانے کا بندوبست کرنے چلا گیا۔۔
اب روزانہ تین بار وہ شخص ان کے لیے کھانا لاتا اور چلا جاتا۔۔
گھر کا دروازہ مقفل ہوتا۔۔ نہ وہ باہر جا سکتے تھے۔ نہ کسی سے مل سکتے تھے۔
ایجنٹ کے ساتھی سے پوچھتے کہ ہم باہر کیوں نہیں نکل سکتے۔۔
تو وہ جواب دیتا۔۔ ابھی آپ کی گاڑی نہیں آئی۔
اس بیسمنٹ میں رہتے ہوئے انھیں دو ہفتے بیت گئے۔۔ آخر کار ایک دن ایجنٹ کے ساتھی نے مژدہ سنایا کہ گاڑی آ گئی ہے۔۔ جو انھیں یونان سے سویڈن لے جائے گی۔
وہ یونان دیکھے بنا ہی دو ہفتے وہاں رہ کر یورپ کے خوبصورت اور پرسکون ملک سویڈن جا رہے تھے۔۔ وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔۔ یہ سب ایجنٹ کے ساتھی نے انھیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔۔
گاڑی ایک بند کنٹینر تھا۔۔۔ جس میں سبزیاں اور زیتون کے تیل کے بڑے بڑے کارٹن پڑے تھے۔ ان کے درمیان ان سب کے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔۔ یہ کنٹینر سامان لے کر سویڈن جا رہا تھا۔۔
راستے میں کئی ممالک آئے مگر کہیں بھی اس کنٹینر کو چیک نہیں کیا گیا۔
چار روزہ سفر کے بعد کنٹینر ڈرائیور نے انھیں ایک جنگل کے قریب اتار کر بتایا۔۔ کہ وہ سویڈن پہنچ چکے ہیں۔۔ دو گھنٹے کی واک کے بعد وہ سویڈن کے شہر مالمو میں داخل ہو جائیں گے۔۔ اس کے بعد انھوں نے وہی کرنا ہے جو کچھ انھیں ایجنٹ اور اس کے ساتھی نے بتایا ہے۔
انھیں اتار کر کنٹینر جا چکا تھا۔ اب وہ دس لوگ تھے۔۔ جب ایران سے چلے تو اٹھارہ تھے۔۔ آٹھ لوگ یونان کے جنگلوں میں تھک کر رہ گئے تھے۔۔ جو اب تک جانوروں کی خوراک بن چکے ہوں گے۔۔ یہ سوچ کر ہی شیما کانپ اٹھتی۔۔ اس کا دل چاہتا کہ کسی طرح واپس بھاگ جائے۔۔ مگر اب تو مشکل وقت ختم ہو چکا تھا۔۔ منزل

قریب تھی--اس لیے ہمت کر کے--سب کے ہمراہ پیدل چل پڑی۔
کریم اس کے ساتھ تھا--اور اس کا خیال رکھ رہا تھا۔
شہر کے قریب پہنچ کر وہ سب مختلف اطراف میں چل دیے--
کریم اور شیما---قریبی پولیس اسٹیشن پہنچے--اور انھوں نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔
یہاں بھی انھوں نے خود کو میاں بیوی ظاہر کیا--اور بتایا کہ ان دونوں کے خاندان ان کی شادی سے ناخوش ہیں--اور شیما کے بھائی ان کو قتل کرنا چاہتے تھے--اس لیے وہ جان بچا کر بہت مشکل سے یہاں پہنچے ہیں۔
سویڈن پولیس نے ان کی کہانی سن کر انھیں مہاجر کیمپ میں پہنچا دیا--جہاں انھیں ایک کشادہ کمرہ آرام دہ بستر دیا گیا--اس عمارت میں اور بھی کمرے تھے--جہاں مختلف ممالک سے آئے مہاجرین رہ رہے تھے--ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔
ایک بڑے ڈائننگ ہال میں--کھانے کے اوقات کا چارٹ لگا ہوا تھا--چائے کافی پانی اور بسکٹ ہر وقت دستیاب تھے--
ان دونوں کو دو بیگ بھی دیے گئے--جس میں ان کے روزمرہ استعمال کی اشیاء بھی موجود تھیں۔
یہ عمارت ایک ہوٹل یا ہاسٹل جیسی تھی--کشادہ روشن--کہیں آنے جانے کی پابندی بھی نہیں تھی--
انھوں نے باہر جا کر قریبی مارکیٹ سے دو سمیں خریدیں--اور اپنے اپنے گھر والوں کو اپنی خیریت کی اطلاع دی۔
دوسرے روز ان کو بنک کارڈ دے دیا گیا--اور کچھ رقم ان کے اکاؤنٹس میں جمع کروا دی گئی--جو وہ کسی بھی اے ٹی ایم سے نکلوا سکتے تھے--اور ان کارڈز سے شاپنگ بھی کر سکتے تھے--
تین روز کے بعد ان کو ایک بس میں بیٹھا کر ایک نئے شہر کی طرف روانہ کر دیا گیا--
دس گھنٹے کے سفر کے بعد بس ایک ویرانے میں پہنچی--یہ ایک بے آباد جگہ تھی جہاں صرف ایک پرانی بوسیدہ عمارت تھی--اس جگہ کا نام آسکرسنڈ--تھا--یہاں مختلف ملکوں کے بہت سے مہاجرین تھے--جن میں زیادہ تعداد صومالیہ سے آئے مہاجرین کی تھی۔
آسکرسنڈ کے ایک ویران جنگل میں ایک پرانی عمارت تھی--جس کے کمروں میں نئے بستر لگا کر اسے مہاجرین کا کیمپ بنایا گیا تھا---
اس کیمپ کا ٹھیکہ۔جمی۔نامی شخص کے پاس تھا---جس نے یہ عمارت سستے داموں خرید کر اس کو ایک ہاسٹل کی شکل دی تھی--
جمی ایک بزنس مین تھا---اس نے سویڈن

کے محکمہ مہاجرین سے ٹھیکہ لے کر مختلف دور دراز کے ویران شہروں میں ایسے کئی ہاسٹل بنا رکھے تھے جہاں مختلف ممالک سے آئے مہاجرین کو رکھا جاتا تھا۔

اس سے قبل مہاجرین کو افراد کی تعداد کے حساب سے رہائش کے لیے گھر دے دیے جاتے--- بچوں والے خاندانوں کو بڑے اور زیادہ کمروں والے گھر ملتے جو آبادی کے قریب ہوتے اور ان کے بچوں کو فوری طور پر سکولوں میں داخل کروا دیا جاتا۔

ان دنوں بڑوں کو سویڈش سکھانے کے لیے بھی کلاسوں کا اہتمام تھا--- مگر اب حالات تبدیل ہو چکے تھے--- ہر رنگ، نسل، عمر اور مذہب کے لوگوں کو ایک ہاسٹل میں رکھا جا رہا تھا--- اکیلی خواتین اور مردوں کو ایک کمرے میں تین تین چار چار کے حساب سے ٹھہرایا گیا تھا--- جبکہ خاندان والوں کو الگ کمرے دیے گئے تھے۔

شیما اور کریم کو بھی چوتھی منزل پر ایک کمرہ مل گیا--- مہاجرین میں سب سے زیادہ تعداد صومالیہ کے لوگوں کی تھی--- جن کے ساتھ بچے بھی تھے--- صومالیہ کے لوگوں نے ایک کمرے کو مسجد بنا لیا--- اور پانچ وقت اذان دے کر باجماعت نماز پڑھنے لگے---

افغانی لڑکے بھی بہت سے تھے--- جن میں سے اکثر کا تعلق پاکستان کے سرحدی علاقے سے تھا--- یا جو لوگ نسل در نسل پاکستان میں مقیم تھے--- لیکن یہاں افغانی پاسپورٹ پر آئے تھے۔

ایک افغانی خاندان--- کابل سے آیا تھا--- ایک مرد اس کی بیوی چار بچے جن میں بڑا بیٹا اور بیٹی جوان تھے۔ اور دو بچے دس بارہ برس کے قریب تھے--- ان کے ساتھ ان کی والدہ بھی تھی---

بڑی بیٹی شادی شدہ تھی--- مگر وہ اپنے والدین کے ساتھ آئی تھی۔

عمارت کا بڑا ہال ڈائننگ روم تھا جہاں دن میں تین بار کھانا تقسیم ہوتا--- کچھ لوگ وہیں بیٹھ کر کھانا کھاتے--- اور کچھ اپنے اپنے کمروں میں کھانا لے جاتے---

اسی طرح کچھ غسل خانے مردوں اور کچھ خواتین کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے۔

سارے ہاسٹل کا انتظام جمی کا بڑا بیٹا یوجنس سنبھالتا تھا--- یوجنس سترہ سال کا نوعمر لاپرواہ سا نوجوان تھا---

کھانا ماگریشن کا عملہ لے کر آتا--- تقسیم کرتا اور چلا جاتا---

یہ کھانا کسی فائیو سٹار ہوٹل سے کم نہ تھا--- مگر ایک لڑکا کھانے سے پہلے استفسار کرتا کہ کیا یہ حلال ہے؟

چکن تو حلال ہی ہوتا ہے؟

اس کو جواب ملتا

کیا یہ چکن اسلامی طرز پر ذبح کیا گیا ہے؟

یہ اس کا دوسرا سوال ہوتا۔

طریقہ ذبح سے کیا فرق پڑتا ہے۔
اس کو دوسرے مسلمان ملکوں سے آئے لوگ سمجھاتے---
ہم مسافر ہیں پردیس میں ہیں-- یہاں جو بھی ملے غنیمت ہے
لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی---
ہمیں حلال گوشت لا کر دو--- ورنہ دالیں اور سبزیاں لاؤ--- ہم یہ گوشت نہیں کھا سکتے--- جسے تکبیر کے بغیر ذبح کیا گیا ہو---
لیکن یہ اعتراض کرنے والا وہ واحد ہی تھی--- باقی سب افغانی، صومالی، اور مختلف ممالک کے مسلم بڑے شوق سے وہ کھانا تناول فرماتے اور پھر مسجد والے کمرے میں جا کر نماز بھی ادا کرتے۔
سویڈن میں دن کے ایک بجے ہی اندھیرا چھا جاتا--- ابھی وہ دوپہر کا کھانا کھا رہے ہوتے تو کھڑکیوں سے رات جھانکنے لگتی--- سکینڈے نیویا کے دو ملک ناروے اور سویڈن ایسے ہیں جہاں سردیوں میں دن صرف دو چار گھنٹوں کے اور راتیں بہت طویل ہوتی ہیں---
اندھیرا چھاتے ہی عجب گھبراہٹ اور اداسی کا احساس ہوتا۔
کچھ لوگ خواہ مخواہ اودھم مچاتے کہ ہمیں جنگل میں رکھا گیا ہے--- جہاں نہ کوئی بس آتی ہے نا ٹرین اسٹیشن ہے--- قریبی آبادی آسکرسنڈ شہر میں ہے جو بیس منٹ کی پیدل واک پر تھا---
ان کا مطالبہ تھا کہ انھیں رہنے کے لیے گھر دیے جائیں ان کے بچوں کو سکول بھیجا جائے تاکہ وہ ایک نارمل زندگی گزار سکیں۔
یہ احتجاج کرتے ہوئے وہ برتن توڑ دیتے--- فرنیچر کو آگ لگا دیتے--- اونچی آواز میں بولتے---
ہاسٹل کا انچارج --- یوحنس --- نہایت اطمینان سے یہ سب دیکھتا رہتا---
وہ کسی کو منع بھی نہیں کرتا تھا---
شاید اسے اس کی اجازت نہیں تھی۔
یا پھر سارا سامان فرنیچر تو امیگریشن ڈیپارٹمنٹ کا تھا---
ہفتے میں دو بار امیگریشن کا عملہ بھی آتا لوگوں کے مسائل سنتا اور انھیں جلد گھر دلانے کا وعدہ کر کے چلا جاتا۔
آسکرسنڈ ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر تھا--- جس کے آغاز میں ایک بڑا سا چرچ اور قبرستان تھا --- کچھ دکانیں اور ریسٹورنٹ بھی تھے --- ایک بس اسٹینڈ تھا --- جہاں سے مختلف شہروں کی طرف بسیں جاتی تھیں---
یہ شہر عمر رسیدہ ریٹائرڈ لوگوں کے لیے آباد کیا گیا تھا---
اس لیے تمام آبادی بزرگ شہریوں پر مشتمل تھی--- اس شہر میں ایک بڑا ہسپتال اور ایک لائبریری بھی تھی---

لیکن اس شہر تک جانا بھی ہاسٹل والوں کے لیے مشکل تھا۔

ایک دن مائگریشن والوں نے کچھ مہاجرین کو آسکرسنڈ کے ایک ہوٹل میں منتقل کر دیا۔ یوں مہاجرین کی منتقلی شروع ہوئی۔۔۔ ہفتہ میں ایکبار۔۔ چند مہاجرین کو مختلف شہروں کے گھروں میں شفٹ کیا جانے لگا۔

جن کا آغاز ان خاندانوں سے کیا گیا۔۔۔ جن کے بچے چھوٹے تھے۔

امیگریشن کا عملہ۔ آ کر یہ نوید دیتا کہ اب کن خاندانوں کی باری ہے۔۔۔ تو سب ان کو مبارکباد دیتے۔

اور مایوس ہو کر اگلے ہفتے کا انتظار کرتے کہ انھیں بھی رہنے کے لیے گھر ملے گا۔

ایک مہینہ اس ہاسٹل میں گزارنے کے بعد شیما اور کریم کی باری بھی آ گئی۔۔۔ انھیں آسکرسنڈ سے ایک نئی جگہ گولڈز میشوتن پہنچا دیا گیا۔۔

گو یہ بھی سویڈن کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔۔ جہاں کچھ گھر تھے۔۔۔ ایک بڑا سا چرچ تھا۔۔ جس کے اردگرد قبرستان تھا۔۔۔ سڑک کے پار پٹرول پمپ اور بس اسٹینڈ تھا۔

پٹرول پمپ کے ساتھ ایک دکان تھی۔ ایکا۔۔ جو ایک گروسری سٹور تھا۔۔ اس میں ڈاکخانہ بھی تھا۔۔ اور کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ ضروریات زندگی کی اشیاء، سٹیشنری اور گھریلو استعمال کے برتن بھی دستیاب تھے۔۔ سٹور کے ساتھ اے ٹی ایم مشین بھی موجود تھی۔

شیما اور کریم کو ایک دن بیڈ روم فلیٹ دیا گیا۔ یہ فلیٹ عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔۔۔ اس عمارت میں کل دس فلیٹ تھے جن میں سے چار امیگریشن کے پاس تھے۔۔۔ جن میں مہاجرین کو رکھا جاتا تھا۔

شیما بہت خوش تھی۔۔ بیڈ روم میں دو بیڈ لگے تھے اس پر نئے گدے اور بستر بچھے تھے۔۔ ڈائینگ روم میں چار کرسیوں والی ڈائینگ ٹیبل تھی اور تمام ضرورت کے برتن سجے تھے۔ ساتھ میں ایک بڑا فریج بھی تھا۔۔ بال کمرہ بہت بڑا تھا جس کی بالکونی سے دور تک پھیلی گھاس اور بڑی سڑک دکھائی دیتی تھی یہاں بھی ایک صوفہ اور ایک بیڈ موجود تھا۔۔ باتھ روم کشادہ تھا جس میں باتھ ٹب لگا تھا۔ سارے فلیٹ میں چار بڑے ہیٹر بھی تھے۔۔۔ جو آن تھے کیونکہ سردی کا آغاز ہو چکا تھا۔

شیما اور کریم بہت خوش تھے۔۔ ایک لمبی مسافت کے بعد انھیں یہ گھر نصیب ہوا تھا۔۔ مگر ابھی اصل مرحلہ باقی تھا۔۔ یہ تو عارضی رہائش تھی۔۔ اس کے بعد ان کا اسائلم کا کیس شروع ہونا تھا۔۔

پھر بھی وہ بہت خوش تھے۔۔ کہ مہینوں بعد انھیں نارمل طریقے سے زندگی گزارنے کا

موقع ملا تھا۔۔

برف باری شروع ہو چکی تھی۔۔۔ تمام درخت اور سبزہ سفید رنگ اوڑھ چکا تھا۔ روزانہ رات کو سڑکوں پر نمک چھڑکنے والی جگمگاتی گاڑیاں گزرتیں جو نمک پاشی کرتیں۔۔۔ یوں صبح ہونے تک رات کو برسنے والی برف پگھل چکی ہوتی۔۔۔ اور سرمئی دھلی ہوئی سڑک پر ٹریفک رواں رہتی۔

بلند و بالا کلیسا کی چھت۔۔۔ اور قبرستان کی قبریں بھی برف کے سمندر میں گم ہو چکی تھیں۔۔۔ گھاس کے میدان میں رکھے بنچوں پر بھی برف جم چکی تھی۔۔۔

ایسے میں شیما اور کریم دستانے اور ٹوپیاں پہنے لمبی جیکٹ اور ربڑ کے لمبے بوٹ پہنے روزانہ گھر سے نکلتے۔

وہ روزانہ ستورا کے ہسپتال جاتے اور مختلف بیماریوں کا بتا کر اپنا چیک اپ کرواتے رہتے۔۔۔

انھیں کیمپ میں آنے سے پہلے ایجنٹ نے بتایا تھا کہ بیمار لوگوں کو سویڈن کے رحم دل لوگ جلدی رہائشی کارڈ دے دیتے ہیں۔

شیما اور کریم بہت خوش تھے۔۔۔ لیکن کبھی کبھار ان میں شدید لڑائی بھی ہوتی۔

وہ رات بھر ایک دوسرے کے ساتھ بحث مباحثہ کرتے۔۔۔ شیما کی آواز اونچی ہوتی۔۔۔

لیکن دوسرے روز وہ نارمل انداز میں مسکراتے ہوئے برف کے درمیانی راستے سے گزرتے ہوئے بس اسٹینڈ کی طرف جا رہے ہوتے۔

اسی دوران عید نوروز آ گئی۔۔۔

عید نوروز کے لیے انھوں نے مختلف کھانے پکائے اور قریبی جھیل کے کنارے جا کر روایتی انداز میں ہر ہفتے عید نوروز کا جشن مناتے رہے۔

کھانے کے ساتھ وہ اپنا روایتی قہوہ بھی بنا کر لے جاتے اور جھیل کنارے درختوں کی چھاؤں میں لکڑیوں سے آگ جلا کر بیٹھ جاتے۔

کھانا اور قہوہ دن بھر چلتا۔۔۔ شام کے اندھیرے پھیلتے تو گھر واپس آ جاتے۔

مارچ کے دوسرے ہفتے میں برف پگھلنا شروع ہو گئی تھی۔۔۔

درختوں سے ہرے پتے جھانکنے لگے تھے۔۔۔ جھیل کا برفاب پانی پگھل کر شیشے جیسا چمکنے لگا تھا۔

شیما اور کریم کو یقین ہو گیا تھا۔۔ کہ اب ان کی منزل قریب ہے۔۔۔ ان کی مہینوں کی مسافت اور مشقت کا پھل ملنے کے قریب ہے۔۔ اب انھیں سویڈن میں رہائش کا پرمٹ مل جائے گا۔۔۔ اور وہ اپنے خاندانوں کو بھی یہاں بلا لیں گے۔

یوں ایک نیا کامیاب مستقبل ان سے تھوڑی مسافت پر تھا جس کے انھوں نے خواب دیکھے تھے۔

لیکن اس یقین کے ساتھ ہی ان کے اختلافات بڑھتے جارہے تھے۔۔۔روزانہ رات کو ان کے جھگڑنے کی آوازیں آتیں۔۔ اکثر شیما چیخ چلا رہی ہوتی۔۔۔ شاید وہ کریم سے اپنے زیور اور رقم واپس مانگ رہی تھی۔۔ جو دوران سفر اس نے کریم کے پاس رکھوائے تھے۔۔ مگر کریم اب ان سے مکر گیا تھا۔۔

وہ کہتا اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔۔

جبکہ شیما کو شک تھا۔۔ کہ اس کی رقم اور زیورات کریم نے۔۔ سویڈن کے دوسرے شہر میں رہنے والی اپنی بہن کے حوالے کر دیے ہیں۔

دوسرے روز وہ پھر ہسپتال جارہے ہوتے یا پھر امیگریشن آفس۔

ایک دن انھیں یہ خوشخبری مل ہی گئی کہ سویڈن کے امیگریشن والوں کو ان کی مظلومیت اور مسائل کا یقین آگیا ہے اور انھیں سویڈن میں رہائش کے کارڈ دے دیے گئے۔

دونوں بہت خوش تھے۔۔ انھوں نے دیر تک قہوے کی میز پر بیٹھ کر اپنی آئندہ زندگی کے پلان بنائے اور پھر اپنے نئے گھر کے لیے ضروری اشیا کی خریداری کرنے چلے گئے۔۔ مگر رات بھر واپس نہ آئے۔۔۔

دوسری صبح کریم نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔۔

میں نے دروازہ کھولا

وہ پریشان لگ رہا تھا

''کیا شیما آپ کی طرف آئی ہے؟''

اس نے سوال کیا

''کیوں کیا کہیں گئی ہے؟''

میں نے پوچھا

''پتہ نہیں گھر پر نہیں ہے''

''سامنے والے گھر سے پتہ کرو۔۔''

اس گھر میں - مقدونیہ کا خاندان رہتا تھا۔۔ شیما کی مقدونیہ کے باشندے پیٹر کی بیوی اور نوعمر بیٹیوں سے دوستی تھی۔

کریم نے کہا۔۔ ''میں نے پتہ کیا ہے شیما وہاں بھی نہیں ہے''

''کہاں جاسکتی ہے۔۔ واشنگ روم یا پھر ہو سکتا ہے کچھ خریدنے۔۔ ایکا۔ چلی گئی ہو''

میں نے کہا۔۔

جس پر کریم نے بتایا کہ وہ ہر جگہ اسے دیکھ چکا ہے۔۔۔ شیما کا فون بھی بند ہے۔

وہ یونہی پریشان پھرتا رہا۔۔۔

دوسرے روز بلڈنگ کے باہر پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔۔۔ دو پولیس والے عمارت میں داخل ہوئے جن میں ایک عورت اور دوسرا مرد تھا۔۔

دونوں نے بلڈنگ کے تمام مکینوں سے شیما اور کریم کے بارے کچھ سوالات کیے۔۔

اور پھر کریم کو ہتھکڑی لگا کر پولیس گاڑی میں بیٹھا کر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

جینے کی خودکشی

کلیم خارجی

ایک بار میں نے پروں کے بغیر اُڑنے کی کوشش کی تو بلندی سے نیچے گر کے میں لہولہان ہوگیا۔ لیکن بلندی کا خوف میرے دل سے ہمیشہ کے لیے غائب ہوگیا۔ پھر میں نے عمارتوں اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پہ چڑھ کر ہوا میں کودنا شروع کر دیا۔ لوگ میرا تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگے۔ موسمی میلوں اور تہواروں کے دوران لوگ مجھ سے پہلے شہر سے دُور پہاڑی سلسلوں کی طرف جانے لگتے۔ اور میرا زمین پر گر جانے کے بعد میرے بدن کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھتے حیران ہوتے اور میرے جیبیں بھر دیتے۔

پھر اِک دن بادشاہ کا مشیر خاص چند سپاہیوں کے ہمراہ میرے دروازے پہ آ پہنچا مجھے اپنے سامنے کھڑا کر کے وہ للکارتے ہوئے بولا۔ جب بادشاہ کے حکم پہ ہم مجرموں کو سزائے موت دینے کے لیے پہاڑوں سے نیچے گرانے لگتے ہیں۔ تو وہ اعتماد اور عجیب طرح کی خوشی میں تمہارا نام لے کر گرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اس طرح کئی دنوں سے بہت سے مجرم نیچے گرنے کے بعد زخمی ہو کر بچ جاتے ہیں اس لیے اب بادشاہ نے نیا حکم جاری کیا ہے کہ

نیچے گرائے جانے والے مجرموں پہ بھاری پتھر بھی پھینکیں جائیں۔ یوں مرنے والا جس اضافی اذیت سے گزرے گا اس کی تمام تر ذمہ داری تم پر عائد ہوگی۔ بادشاہ سلامت کو اس بات سے شدید رنج پہنچا ہے اس لیے بادشاہ سلامت نے مجھے یہ سوال دے کر بھیجا ہے کہ تمہارا اس دُنیا میں زندہ رہنا کیوں ضروری ہے۔

میں روزانہ خودکشی کا عادی ہو چکا تھا۔ مجھے بادشاہ پہ سخت غصہ آیا۔ لیکن نے مشیر کی بزرگی دیکھ کر قدرے شائستگی سے کہا۔ میں ایسے بادشاہ کے ہوتے ہوئے مزید زندہ رہنا پسند نہیں کروں گا۔ میں اپنی مرضی سے مرنے کے لیے تیار ہوں۔ اور اس بار میں اس زمین کی سب سے بلند چوٹی پر چڑھ کر نیچے چھلانگ لگاؤں گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گہری اور تاریک گھاٹیوں سے گم ہو جاؤں گا۔ مشیر کو رخصت کرنے کے بعد رات جب میں نے اپنی موت کے بارے میں سوچا تو بے حد خوشی ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں دوبارہ کوئی جنم لینے لگا ہوں۔ کیونکہ میں جان چکا تھا کہ میں جن خوبصورت لوگوں سے مل چکا ہوں ان سے زیادہ خوبصورت لوگ دُنیا میں دوبارہ نہیں دیکھے جاسکیں گے۔ میں نے دُنیا میں جتنی بھی حسین و دلکش چیزیں دیکھ لی ہیں۔ ان میں سے زیادہ حسین و دلکش چیزیں دُنیا میں آئندہ دیکھے جانے کی اُمید نہیں۔ میں نے جو پھل پھول، موسم اور ذائقے چکھ لیے ہیں آنے والے وقتوں میں ان سے بہتر کا کوئی امکان نہیں رہا۔ سو میں نے خوشی میں رقص کیا اور آدھا پیالہ شراب پی کر سو گیا۔

اگلی صبح جب میں زمین پر موجود سب سے بلند ترین پہاڑ کی طرف جانے لگا تو بادشاہ کے سپاہی وزیر، بچے، بوڑھے اور نوجوان سب ہجوم کی شکل میں میرے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ سورج پوری طرح سے چمکا تو میں پہاڑ پہ کافی فاصلہ طے کر چکا تھا۔ لیکن چوٹی پہ پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی تھی میں نے نیچے سر جھکا کر دیکھا تو مجھے بادشاہ کے ہاتھیوں کی فوج دکھائی دی جن پر بادشاہ اور اس کے خاص مصاحب منہ اُٹھائے مجھے گھور رہے تھے۔

اندھیرے کی وجہ سے مجھے وہ تمام لوگ نظر نہ آئے۔ جو مجھے بلندی سے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھنے کے بعد میری طرف لپکتے اور مجھے زندہ سلامت دیکھ کر خوشی سے جشن منانے کے عادی ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا کر الوداع کیا۔ اور پھر دوڑتے ہوئے اپنے سامنے وسیع اور سیاہ خلا میں چھلانگ لگا دی۔ دفعتہً میری قمیض پھٹ گئی اور میرے پر پھڑ پھڑا کر ہوا میں پھیل گئے۔

☆☆☆☆☆

ماضی اور قاضی.....!

دوستو! گئے وقتوں کی بات ..... لیکن نہیں..... ابھی زمان و مکاں کی اصل حقیقت مکمل طور کھلی کہاں.....! تاہم فطری تجسس اور کھوج نے غاروں سے عہدِ نو تک ہر لحہ نت نئی دریافتوں کے تسلسل کو کبھی ٹوٹنے بھی تو نہیں دیا۔ یہ الگ بات کہ انسانی فطرت کے دیگر پہلو بھی تادمِ تحریر وہی ہیں .....جو کل تھے۔ اب کل اور آج میں کیا فرق.....اس سے قبل کہ کسی نئی بحث کا آغاز ہو..... فیصلہ آپ پر ہی چھوڑتے ہوئے سیدھے کہانی کی طرف آتے ہیں۔

لیجئے! بات کچھ یوں ہے کہ ایک مرغی فروش ہوا کرتا تھا۔ شاید اس کا نام عاشق یا پھر..... یہ بھی خوب رہی.....! ذہن پر زور تو بہت دیا لیکن یاد نہیں آسکا۔ چلئے چھوڑیں.....! بھلے جو بھی نام تھا ہم عاشق ہی سے گزارا کر لیتے ہیں۔ یوں بھی مندرجہ بالا نام کی مناسبت سے ذکر کیا چھڑا..... عاشقی کی سب تاوان نما کیفیات اپنی تمام تر جزئیات سمیت دل کی ساکن جھیل میں بس یونہی ہلچل سی مچانے کیلئے تلخ و شیریں یادوں کا کنکر نجانے کہاں سے یوں کھوج لائیں جیسے صدیوں کی راکھ راکھ قاضیٔ شہر کا اس کی دکان سے کہیں گزر ہوا۔ نظر دکان میں موجود واحد مرغی پہ پڑی جس کا گوشت بنایا جا رہا تھا۔ اس کا دل للچایا اور قدم خود بخود اسی طرف اٹھ گئے۔ عاشق کے ہاتھ مارے پریشانی کے رک گئے اور چھری جیسے ہوا میں معلق سی ہو کر رہ گئی۔ بات ہی ایسی تھی۔ قاضی کا رعب اور دبدبہ..... دبے ہوئے غریب مرغی فروش کو مزید دبانے کے لیے کیا کم تھا۔ اس کی پریشانی اور خوف کو قاضی نے دور سے ہی تاڑ لیا اور دل میں لڈو یوں پھوٹنے لگے جیسے یہ بھی پکی پکائی مرغی ایڈوانس میں ہضم کرنے کی کوئی نئی دریافت ہو۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر قطعی انداز میں دور سے ہی حکم صادر ہوا کہ مرغی کو اچھی طرح سے صاف کر کے پوٹلی میں لپیٹ دیا جائے۔

اب تو مارے خوف کے عاشق کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ''حضور کا حکم سر آنکھوں پر..... جان بھی حاضر ..... لیکن.....!'' کپکپاتی آواز میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''لیکن.....لیکن کہا کیسے.....اوئے..... یہ لیکن

شہزاد تصور

ہوتا کیا ہے..... اور..... تم ہو کون ہمارے سامنے یوں بولنے والے، جانتے نہیں ہمیں کیا.....!''
اس کے لہجے میں غصہ کم..... قطعیت زیادہ تھی جبکہ ایک ایک لفظ کچھ یوں چبا چبا کر ادا کیا گیا جیسے مرغی کے بجائے عاشق کی ہڈیاں تک شکم میں اتار لینے کا پروگرام ہو۔
''ج..... جج..... جانتا ہوں حضور..... آپ تو جسے اور جب چاہیں جو مرضی سزا دے سکتے ہیں۔ وہ اصل میں..... سب مرغیاں تو کب کی فروخت ہو چکیں، دکان بند کر رہا تھا کہ یہ ایک زندہ مرغی کوئی گاہک ذبح کروانے اور گوشت بنوانے کے لیے میرے پاس لئے چلا آیا۔'' وہ خود بھی لاعلم تھا کہ دل میں چھپی سچائی زبان تک کیسے آ گئی۔
''کونسا گاہک..... کیسا گاہک..... یہ بک بک چھوڑو۔ زبان درازی ہمیں بالکل پسند نہیں..... البتہ یہ مرغی ہمیں پسند آ گئی ہے۔ اگر کوئی کمبخت ذبح کروانے لایا تھا تو کہاں ہے وہ.....؟ جھوٹ بولنے کے جرم میں قید خانے میں ڈالا تو سر باہر آئے گا ضرور لیکن کٹا ہوا۔ چلو شاباش جو کہتا ہوں وہ کرو۔'' قاضی نے اس مرتبہ کڑکدار لہجے میں گویا مفاداتی مقدمے کا فیصلہ بھی سنا دیا ہو۔
اب تو اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ چکر آنے لگے اور دن میں تارے نظر آنے کا محاورہ اس روز پہلی مرتبہ مجسم حقیقت کی صورت یوں اختیار کر گیا کہ آنکھوں کے سامنے سچ مچ نیلے پیلے تاروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
اس نے لرزتے ہاتھوں سے مرغی پوٹلی میں ڈالنے کی کوشش کی تو وہ الٹی پکڑنے کے باعث گوشت سامنے پڑے پھٹے پر گر گیا۔
''مرگی کا دورہ تو نہیں پڑ گیا کیا..... پوٹلی سیدھی کرو، اب ہم کیا الٹی پوٹلی میں اس مرغی کو لے جائیں گے۔'' اس مرتبہ قاضی کی گھرک پہلے سے بھی کاٹ دار اور چبھن آمیز تھی۔ سانس کے حلق میں اٹک جانے کی وجہ عاشق کا حد سے بڑھا ہوا خوف تھا جس میں اضافے کا سبب شاید ان دو سپاہیوں کا قاضی کو دیکھ کر مؤدب انداز میں اس کے پیچھے کھڑے ہو جانا تھا جو قریب سے گزر رہے تھے جبکہ تلواریں میان سے یوں نکلی تھیں جیسے نجانے صدیوں سے خون کی پیاسی ہوں۔
''حضور..... آپ مائی باپ ہیں۔ گاہک زندہ مرغی دیتے ہوئے یہ کہہ کر چلا گیا کہ اسے ذبح کر کے گوشت بناؤں اور ابھی تھوڑی دیر میں وہ باقی کام نمٹا کر واپس آ جائے گا۔ کیا جواب دوں گا اسے میں.....؟'' اس کے منہ سے یہ الفاظ عجیب ممیاتے ہوئے انداز میں خود بخود پھسل گئے۔ اسے اپنی غلطی پر افسوس ہو رہا تھا لیکن عین اسی وقت یاد آیا کہ کوئی مرغی چاہے کتنی ہی تگڑی اور مزاحمت کرنے والی..... اور بھلے اس کے ہاتھوں ذبح ہو کر رہنا ہو لیکن اس کے گلے سے نکلنے والی احتجاجی آواز کو وہ کبھی دبا نہیں سکا۔ شاید بالکل اسی طرح آج طاقتور کے سامنے اس کی کمزوری ذبح

ہونے سے پہلے قدرتی احتجاج بن گئی ہو۔ یقیناً اب وہ ہر طرح سے مارا جائے گا۔ یہی ایک خیال دل و دماغ پر آسیب کی طرح سوار تھا۔ لیکن اس کے بالکل الٹ قاضی کی ہنسی چھوٹ گئی اور اس نے اپنے ہاتھ باقاعدہ ہوا میں یوں مضحکہ خیز انداز میں لہرائے جیسے مرغی کو اڑا رہا ہو۔ ''یہ لو اڑ گئی.....! اب سب ٹھیک..... جیسے میں نے کیا ہے ایسے ہی کہنا اپنے اس گاہک کے بچے سے..... کہ اڑ گئی مرغی.....!'' یہ سن کر دونوں سپاہی بے ڈھب انداز میں ہنسنے لگے۔ قاضی کو یکدم نجانے کیا ہوا کہ اس نے دونوں کی طرف گھور کر یوں دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو کہ ہمارے سامنے جرأت کیسے ہوئی تمہاری ہنسنے کی۔ یہ الگ بات کہ ایک لفظ بھی ادا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، چہرے کے تاثرات ہی کافی تھے۔ دونوں کی ہنسی یکدم رک گئی اور سانس جیسے حلق میں اٹک کر رہ گئے ہوں۔ فضا میں بالکل خاموشی طاری ہوگئی۔ سپاہی کچھ دیر کے لیے بھول گئے تھے کہ قاضی کی ہنسی میں اپنے کسی بھی ذوق کو شامل کرنے کا مطلب صرف سپاہی نہ رہنا ہی نہیں بلکہ جان سے ہاتھ دھونا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ حیثیت یاد آئی تو سر خود بخود یوں جھک گئے جیسے بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہو۔ قاضی نے ایک گہری سانس لی اور صرف اتنا کہا۔ ''ایسی غلطی دوبارہ نہ کی جائے.....!'' دونوں ہی کے سر بار بار اقرار میں یوں تابعداری سے ہلنے لگے جیسے کسی مقدس گردان میں مصروف ہوں۔

ادھر عاشق تو سر تا پاؤں پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اب کیا وضاحت باقی رہ گئی تھی۔ لیکن پھر اچانک یاد آیا کہ ذبیحہ مرغی نہیں اڑ سکتی۔ بچا کھچا حوصلہ آخری مزاحمت پر تل گیا۔ ''میری جان آپ پر قربان حضور..... سب کچھ آپ کا ہی ہے، جو فرمایا بجا فرمایا..... لیکن اس کمبخت بلکہ بدبخت گاہک..... دل چاہتا ہے اسے خوب گالیاں دوں، گدھے کے سامنے ذبح کر بیٹھا غلطی سے..... اب اسے کیسے یقین دلاؤں گا کہ ذبح کی گئی مرغی اڑ گئی، درجنوں سوال کرے گا جن میں سے کسی کا بھی کوئی جواب تو ہوگا نہیں میرے پاس۔''

''پہلے بھی منع کیا، اب آخری وارننگ ہے، جب ہم کہہ رہے ہیں کہ اڑ گئی تو تم بھی ایسے ہی بک دینا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ تم پر مقدمہ کرے گا..... تو کیا ہوا..... لے دے کر کیس تو ہمارے ہی پاس آئے گا، باقی ہم سنبھال لیں گے.....!'' قاضی نے اپنے سینے پر شان بے نیازی سے انگلی دو، تین مرتبہ ٹکائی۔ ''کوئی کتنی ہی دلیلیں ڈھونڈ لائے، آخری فیصلہ تو ہمارا ہی ہوگا..... تم نے ہماری فرمانبرداری کے صلے میں بری تو باعزت ہو کر رہنا ہے بالآخر، مدعی جو بھی مؤقف اپنائے گا، مرغی تو اسے واپس ملنے سے رہی..... الٹا نہ صرف ڈانٹ کھائے گا

..... بلکہ ذلیل بھی ہوکر رہے گا - چلو شاباش..... اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو مرغی تو پتھر پہ لکیر..... ہماری ہوگئی..... تم حکم عدولی کے جرم میں جان سے بھی کہیں ہاتھ نہ دھو بیٹھنا۔ رحمدل آدمی ہوں، اسی لئے تمہیں سارا طریقہ سمجھا دیا ورنہ اتنا وقت کبھی برباد نہ کرتا۔'' اس مرتبہ اس کے انداز میں حکمیہ دھمکی اور جان بخشی دونوں شانہ بشانہ تھیں۔ خاموشی سے اس نے سر جھکا دیا اور کچھ ہی دیر بعد قاضی سپاہیوں سمیت اپنی راہ ہولیا۔ اِدھر وہ لوگ گئے اور اُدھر گاہک سر پر آن کھڑا ہوا۔ اتنا سننا تھا کہ اس کی لائی ہوئی مرغی اڑ گئی تو وہ بڑا سٹپٹایا اور چلا کر کہا کہ دماغ خراب ہوگیا ہے کیا، کبھی مردہ مرغیاں بھی اڑا کرتی ہیں۔ عاشق کے پاس اس کی بیان کردہ حقیقت کا جواب تو کوئی تھا نہیں البتہ جو سمجھایا گیا تھا بس وہی ایک گردان تھی۔ عاجز آ کر گاہک نے اسے کہا کہ چلو قاضی کے پاس..... تم پاگل ہو گئے ہو، میں مقدمہ کروں گا۔ مرغی تو تم دو گے ہی، قاضی سے جرمانہ بھی کرواؤں گا تمہیں.....! اب مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ اس کے ساتھ بے دلی سے چل دیا اور بے چینی اور اضطراب کا عالم یہ تھا کہ چھری بھی ہاتھ میں اسی طرح رہ گئی جیسے پہلے تھی کیونکہ مرغی کا گوشت اس نے نہیں بلکہ سپاہیوں نے اپنے نمبر بنانے کے لیے پوٹلی میں ڈال کر قاضی کے حوالے کیا تھا۔ وہ تو بس بے بسی سے ان کی چیرہ دستی دیکھتا رہ گیا۔

ابھی آدھے راستے میں تھے کہ سڑک کنارے دو آدمی دکھائی دیئے جو انتہائی غصے میں کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ تلخ کلامی دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھا پائی میں بدل گئی۔ عاشق اور گاہک دونوں نے مل کر چھڑانے کی کوشش کی تو وائے قسمت اس دوران عاشق کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھری ایک آدمی کی آنکھ میں گھس گئی۔ اب تو طرفہ تماشہ تھا۔ وہ دہائیاں دینے لگا کہ میری آنکھ ضائع ہوگئی۔ اس نے بہت صفائیاں پیش کیں کہ میں تو تم دونوں کو لڑنے سے اس لئے روک رہا تھا کہ کسی کو چوٹ نہ لگ جائے لیکن یہ حادثہ ہوگیا۔ اس موئی چھری نے بھی میرے ہاتھ میں ہی رہ جانا تھا۔ لیکن متاثرہ شخص کسی طرح نہیں مانا اور کہا کہ چلو قاضی کے پاس.....! عاشق کو نصیب پر رونا آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوگیا۔ جانا تو پہلے بھی وہیں تھا لیکن اب کیا قاضی معاف کرے گا۔ ہرگز نہیں..... مرغی کا قصہ شاید اپنے مفاد کے لیے نمٹا دیا جاتا لیکن جس کی خواہ مخواہ آنکھ ضائع ہوئی اس کی معافی کس قانون کے تحت ملے گی۔ شاید ایسا کوئی نکتہ قاضی کے پاس بھی نہیں ہو گا کہ وہ صرف ایک مرغی کے لیے اسے دونوں مقدمات سے بری کر دے۔ یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ راستے میں ایک بلند و بالا مسجد دکھائی دی۔ پہلا خیال جو اس کے دل میں آیا یہی تھا کہ بہتر ہے خودکشی کر لی

جائے۔ انصاف تو کب کا قتل ہو چکا۔ اب جب ہر طرف موت ہی موت ہے تو اپنے ہاتھوں خاتمہ بہترین حل ہے۔ چنانچہ اس نے دونوں متاثرین سے کہا کہ بھائیو نماز کا وقت ہو چلا ہے، کیوں نہ نماز پڑھ لی جائے۔ انصاف تو ہو کر رہتا ہے۔ کچھ فرائض اللہ کے حکم کے مطابق بھی ادا کر دیئے جائیں۔ جواب میں دونوں نے کچھ دیر سوچا اور پھر اسے نماز پڑھنے کی اجازت دے دی۔ اب عاشق میاں نے نماز پڑھی اور رو رو کر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور خودکشی پر معاف کر دینے کی دعا بار بار مانگنے کے بعد اٹھ کر مسجد کی چھت کی طرف بھاگا۔ دونوں متاثرین سمجھے کہ شاید فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے چنانچہ وہ بھی پیچھے لپکے...... لیکن قبل اس کے کہ وہ اس تک پہنچ پاتے وہ پہلے ہی چھت سے نیچے کود چکا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ زندگی سے جان چھڑانے کی کوشش میں جب چھلانگ لگائی عین اسی وقت ایک بزرگ نیچے کہیں گزر رہے تھے۔ عاشق کے ساتھ ایک مرتبہ پھر سنگین مذاق ہو گیا، خود بچ گیا لیکن وہ بزرگ جن کے اوپر گرا، جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک مرتبہ پھر لینے کے دینے پڑ گئے۔ ان کا بیٹا مسجد کے صحن میں سینہ پیٹنے لگا کہ میرے باپ کی جان لے لی۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ تھما پھرا کے فیصلہ آخر پھر یہی ہوا کہ قاضی کے پاس چلتے ہیں۔ اب چار لوگ قاضی کے پاس

پہنچے تو وہ ایک مرتبہ ٹھٹکا لیکن اپنے رعب میں کمی نہ آنے دینا شاید اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا "یہ کیا تماشہ ہے، چار لوگ اور لے آتے کہیں سے پکڑ کر......!" لہجے میں گہرا طنز اور آری کی سی کاٹ تھی۔ مخاطب بلاشبہ عاشق ہی تھا۔ جب سارا ماجرا سنایا گیا تو اس نے کہا۔ "جو ہوا بہت برا ہوا، سب سے پہلے جس کے باپ کی جان گئی ہے اس کا فیصلہ سنایا جائے گا کیونکہ مسئلہ قیمتی جان کے ضیاع کا ہے اور ہمارا فیصلہ یہی ہے کہ انسانی جان کے بدلے جان...... چونکہ مدعی مقدمہ مقتول کا حقیقی بیٹا ہے اس لئے وہ بالکل اسی طرح چھت پر جائے گا جیسے ملزم گیا اور اسی طرح چھلانگ لگائے گا جیسے اس نے لگائی جبکہ وہ عین اسی جگہ نیچے کھڑا ہو گا جہاں مقتول موجود تھا۔ یوں جب مدعی کودے گا تو سیدھا ملزم پر گرنے سے موقع پر اس کی موت یقیناً اسی طرح ہو جائے گی جیسے مدعی کے باپ کی ہوئی۔ اس طرح مقتول کے بیٹے کو انصاف مل جائے گا۔"

اتنا سننا تھا کہ مرنے والے کے بیٹے نے بے اختیار کہا۔ "حضور میں تو چھلانگ لگا دوں گا لیکن اگر ملزم ذرا سا بھی آگے یا پیچھے ہٹ گیا تو میں مفت میں جان گنوا بیٹھوں گا۔"

"نہیں...... تمہیں ڈرنا نہیں چاہئے، ہمارا فیصلہ حتمی ہے۔ ملزم عین اسی جگہ کھڑا ہو گا جہاں مقتول تھا۔ اگر پھر بھی کچھ کمی بیشی ہو گئی تو وہ تمہاری قسمت......" قاضی نے غصے

سے کہا۔ ''ملزم جب کودا تو تمہارا باپ بھی تو ذرا سا آگے پیچھے نہیں ہوا۔''

مدعی سہم سا گیا..... جان کے لالے پڑ گئے۔ لیکن پھر ہمت کر کے بالآخر کہہ ہی دیا۔ حضور! یہ فیصلہ کچھ غیر مناسب ہے، ملزم کے بجائے میری جان کو خطرہ زیادہ ہے۔ ذرا سا بھی زاویہ بدل گیا تو یہ بچ اور میں بھی اپنے باپ کی طرح مر جاؤں گا۔''

''خطرہ زیادہ ہے اور جان اتنی پیاری ہے تو سوچ سمجھ کر مقدمہ کرنا چاہئے تھا۔ ہمارے فیصلے کو غلط قرار دے رہے ہو کیا تم.....! بمطابق انصاف جو ہم نے کہنا تھا کہہ دیا۔ سپاہیو! ان دونوں کو اسی مسجد میں لے جا کر بالکل اسی جگہ کھڑا کرو جہاں قاتل اور مقتول کھڑے تھے، تاکہ انصاف ہو سکے'' قاضی نے پہلے ڈانٹ پلائی اور پھر حکم صادر فرمایا۔ کئی سپاہی فوراً آگے بڑھے۔

''رکیئے حضور..... رکیئے! میں نے اپنے باپ کی جان لینے والے کو خدا کے واسطے معاف کیا۔ میں اپنا مقدمہ واپس لیتا ہوں۔ پھر انصاف بھی تو ہو گیا ہے۔'' مدعی تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''تو جاؤ یہاں سے..... خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔'' قاضی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

یوں ایک مقدمے کا فیصلہ تو بخوبی نمٹا دیا گیا۔ اب جس کی آنکھ ضائع ہوئی اس کی باری تھی۔

''ہاں بھئی..... بڑا شوق ہے تمہیں لڑائی جھگڑے کا..... آنکھ گنوا کر بھی عقل نہیں آئی۔ اب کیا چاہتے ہو؟'' قاضی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اسے چھینک آ گئی۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی سی طاری ہو گئی۔ دوبارہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ پھر چھینک..... سب لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

''بیگم کو کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ مرغی کے شوربے میں مرچ کم ہونا چاہئے لیکن نجانے کس مٹی کی بنی ہے۔ کیسے بٹھاؤں اس کے دماغ میں کہ تیز مرچ ہمارے فیصلوں اور انصاف کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''یہ اسی مرغی کی بات کر رہے ہیں حضور جو آپ.....!'' عاشق کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو، کونسی مرغی..... آج تو بھنڈی کھائی ہے۔'' قاضی کے غصے میں کھسیانا پن شامل تھا۔

''شوربے دار بھنڈی.....!'' واہ حضور کیا ذوق ہے آپ کا.....'' عاشق نے تعریف کی تو کمرے میں موجود سب لوگوں سمیت سپاہی بھی واہ واہ کرنے لگے۔ ادھر عاشق دل میں سوچ رہا تھا اگر میں قاضی ہوتا تو مرغی کو بھنڈی میں بدل دیتا تب بھی سب لوگ خواہ مخواہ میری تعریف کرنے پر مجبور ہوتے۔ لیکن قسمت کی بات..... قاضی نہیں ملزم ہوں۔ ایک مقدمے سے جان چھوٹی..... اب آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا.....!

☆☆☆☆☆

قربان گاہ

بعض اوقات یاد سمندر کی سیپی میں قید ہو جاتی ہے اور کبھی خود سمندر بن جاتی ہے جس کا کوئی اور چھور نہیں ہوتا کبھی بھری محفل میں دل چاہتا ہے ارد گرد کوئی نہ ہو کبھی تنہائی بے چینی کا سبب بن جاتی ہے بس اُس لمحہ ریشماں کا وجود ایک ہیولے کی طرح میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

چُھٹ پُٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی دِل نہ ہمارا ٹھہرا

.....

بلکل اس شعر کی طرح۔ پھر آہستہ آہستہ رات کا آنچل سرکنے لگتا ہے اور بہت ہی نرم روی کے ساتھ اُجالا اپنے روشن روشن چہرے کے ساتھ نظر آنے لگتا ہے___ میں سوچتا ہوں کہ تمھاری نوازشوں محبتوں خوابوں میں کتنی سُندرتا کتنی مہک اور کتنی شادابی تھی۔ لفظوں کی بازگشت اب ختم ہو چکی ہے یا لفظ اپنے معنی کھو چکے ہیں شاید رنگ ہی زندگی سے نکل گئے ہیں۔ رنگ جو مہک تھے خوشبو تھے لطافت اور شادابی تھے جب تم میری باہوں میں تھی وہ صبح نو کی شادابی وہ کیف چمپئی دوپہر مَیں تمھاری گھنیری پلکوں کی چھاؤں وہ ٹھنڈا سکون سانولی شام کی وہ مستی رات کا وہ سُلگتا ہوا گداز سب کچھ ختم ہو گیا یوں لگتا ہے اب شاید کسی رات کی صبح نہ ہو گی وہ ایک صبح شاید ایک خواب تھی جب میں تعلیم مکمل ہونے پر، ایک مدت کے بعد گاؤں آیا تھا تمھیں دیکھا تم میں ڈوب گیا اور کس قدر جلد یہ خواب ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گیا بکھر گیا اور اُس کے ساتھ میرا وجود بھی کِرچی کِرچی ہو گیا اپنے وجود کو سمیٹتا ہوں تا کہ پھر سے ایک خواب دیکھ سکوں سہانا خوبصورت رات کا دِن سے مِلنے کا خواب۔ باغ کی روش پر قدم رکھتے ہی قدموں تلے خزاں رسیدہ پتوں کا شور میرے کانوں سے ٹکراتا ہے پھر وہ شور آواز بن کر میرے ذہن میں دیر تک گونجتا ہے۔ ایسی ہی تو

اقبال خان یوسف زئی

ایک شام تھی جب میں نے ریشماں سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو تمام گھر والوں کے چہرے سوالیہ نشان بنے مجھے یوں گھورنے لگے جیسے میں کسی چڑیل سے شادی کرنے والا ہوں۔

اماں نے مجھے گھورتے ہوئے تیوریوں پر بل ڈال کر اپنے مخصوص انداز میں ''ہوں'' کہی۔ ارے لڑکے باؤلا ہوا ہے کیا انھوں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

ہُوا تو نہیں مگر ہو جاؤں گا اور اگر اب میری بات نہ مانی گئی تو عمر بھر شادی نہیں کروں گا۔ غصے سے کھولتے ہوئے اماں نے مجھے مارنے کے لیے پاؤں سے جُوتی نکالی پھر کچھ سوچ کر دوبارہ پہن لی۔ مجھے معلوم تھا وہ حرّافہ میری چھاتی پر مونگ دلے گی۔ وہ چھنال ایک کو تو کھا گئی۔

نہ اماں ایسا نہ کہو۔ میں نے غصہ کو دباتے ہوئے بڑے ضبط سے کہا۔ اتنی وفا شعار اور سلیقہ مند بہو نصیبوں سے ملتی ہے اور پھر اماں وہ میری چچازاد بھی تو ہے۔

نصیبوں پٹی یہ تو رہ گئی تھی اُس کلموہی کی ساس بنے کو۔ اماں نے باقاعدہ اپنی چھاتی پیٹتے ہوئے کہا۔ میں گھبرا کر گھر سے تقریباً بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ ریشماں میری نہ ہونے کے باوجود بھی میرے دل سے نہ نکل سکی۔ میں ماں کو کیونکر سمجھاتا۔

منصور کا نام سُن کر ریشماں ایک دفعہ تو سناٹے میں آ گئی ہوگی۔ میں جانتا ہوں اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ پڑے ہوں گے۔ ہچکیوں اور سسکیوں کو دباتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی گھر والوں کے دباؤ سے بے بس ہو کر اُس نے منصور کو اپنا مجازی خدا قبول کیا ہوگا۔ وہ ہوا کا جھونکا تھی جو مشامِ جان کو معطر کر کے گزر جائے۔ پانی کی موج تھی جو گزر جائے تو پلٹ کر نہیں دیکھتی کون ڈوبا کون اُبھرا۔ بعض چیزیں پسند نہ ہونے باوجود بھی قبول کرنا پڑتی ہیں۔ اور زندگی میں ہم بہت سی ایسی چیزوں کو اپناتے ہیں زندگی کا جزو سمجھ کر اگر ایسا نہ ہو تو اِس دنیا میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں غم کا نام تک نہ ہو۔

ہم ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ ریشماں اوّل تو میرا سامنا کرتے ہوئے ہچکچاتی تھی اگر کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو سہمی سہمی نگاہیں سوال کرتیں۔ عادل! زندگی کے اِس موڑ پر ابھی کتنے جذبوں کو قربان کرنا پڑے گا۔ بھیا انجائی شکی مزاج تھے اور شک کی آگ دونوں طرف وار کرتی ہے ریشماں بھی اِس آگ کی لپیٹ میں ایک پھول کی طرح جل رہی تھی۔

بھیا کی عادتیں اس قدر اُکتا دینے والی تھیں وہ

مجھ سے حقارت سے بات کرتے شاید میری تعلیم سے حسد کا جذبہ شامل ہو گیا ہے۔ میری ہر چیز پر زبردستی قبضہ کر لینا میری کتابیں پھاڑ دینا معمول معمولی بات پر ڈانٹ ڈپٹ، بھیا کو شاید بھنک سی پڑ گئی تھی کہ میں ریشماں کو چاہنے لگا ہوں۔ اُنھوں نے ریشماں کے گھر والوں کو اپنے لیے شدومد سے قائل کر لیا تھا۔

اماں کی پسند کو اِس شادی میں ضِد کی طرح شامل تھی مگر نہ جانے کیوں وہ روایتی ساس بن جاتیں۔ لڑنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کیا جاتا۔ اماں بھیا کو خوب بھڑکاتیں آگ اور بھڑکتی پہاڑی راستوں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر میں اپنے اور ریشماں کے قدموں کے نشان تلاش کرتا رہتا، وہ جگہیں جہاں میں نے اور ریشماں نے محبت کے عہدو پیماں کیے تھے اب سُونی ہو گئی تھیں۔ دل میں کہیں کوئی کسک، خلش، بے کلی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے ہر چیز بلک رہی ہے۔ بے چارگی چارسُو اپنے قدم جما چکی ہے۔ اُداسیوں کے غول دل پہ دھاوا بولنے کے لیے مضطرب اور بے چین ہیں۔ یادیں باہیں کھولے کھڑی ہیں ایک سے بڑھ کر ایک طعنہ گھاؤ بھرنے نہیں دیتا کسی نہ کسی رنج کا اندوہ چین لینے نہیں دیتا:

یہ وہ دریا ہے جس کا نہ کہیں پاٹ لگے
کشتیِ عمرِ رواں دیکھیے کس گھاٹ لگے

پھر خیال ہے آتا زندگی نہ یہ کہ مظلوم بن کر ہر مصائب برداشت کرے اور نہ زندگی وہ ہے کہ ظالم بن کر لوگوں کے دلوں میں نفرت بن کر رہے۔ وہ سارے لمحے ریشماں کے ساتھ وہ بیتے ہوئے لمحوں کی رعنائیاں مٹ چکی ہیں فنا ہو چکی ہیں۔ دل کو ٹٹولتا ہوں کہیں نہ کہیں سے کوئی بھولی بھٹکی یاد دل لبھانے والی ہزاروں ہزار باتیں یاد آتی ہیں جیسے شکستہ کشتی ہوا کی زد میں کبھی اِدھر اُدھر جھکولے کھاتی ہے۔

ریشماں کا چہرہ انگارے کی طرح سُرخ تھا وہ بخار میں جھلس رہی تھی اماں بڑی محبت سے قریب بیٹھی اُس کے ماتھے پر ہولے ہولے اپنا ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

اماں یہ تم ہو_؟ اُنھوں نے شاید میرے چہرے پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھ لیا تھا۔ ارے تو کیا یہ میری بہو نہیں ہے۔

اماں زندگی میں پہلی دفعہ مجھے بہت اچھی لگیں ورنہ ابا سے لڑنے یا ریشماں کو سخت سُست کہنے سے فرصت ہی کہاں تھی۔ ابا کے اچانک فوت ہونے پر تو اُن کا مزاج اور بھی بگڑ گیا تھا میرا کتنا دل چاہتا تھا کہ اُن کے سینے پر اپنا سر رکھ دوں اور وہ مجھے اپنے بازوؤں میں بھینچ کر پیار سے پوچھیں۔ کیا بات ہے میرے بیٹے۔ لیکن ایسا نہ ہوتا کبھی کبھار ایسا ہوتا تو نہ جانے کیوں تشنگی کا

احساس غالب رہتا۔ وگرنہ گھر بھر میں تنہا اُداس پھرتا۔ پھر مجھے ریشماں ملی ذہن میں بسی ہوئی تلخیوں کو اُس نے اپنی پیار بھری مسکراہٹوں سے سجا دیا۔ میں نے اُسے پا کر سب کچھ بُھلا دیا سب کو بُھلا دیا۔

معصوم معصوم نگاہیں میری جانب اُٹھتیں ہولے سے اُس کے ہاتھوں کا لمس میرے بالوں میں سما جاتا میرے دل میں ریشماں کی محبت یوں چھپی ہوئی تھی جیسے سیپ میں موتی، جو سیپ کی کُل کائنات ہوتا ہے میری کائنات بھی ریشماں کی محبت تھی۔ شام کے سائے دھیرے دھیرے بڑھتے دو ہاتھ بے چینی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھتے۔ دو دھڑکتے سائے ایک دوسرے کو دل کی کہانیاں سُناتے لیکن اُن ملاقاتوں کو رات کی تیرگی نے ڈس لیا۔ منصور جس طرح بچپن میں میری ہر چیز پر قبضہ کرنا اپنا حق سمجھتا تھا جوانی میں اُس نے میری ریشماں پر قبضہ کر لیا۔ سیپ کا موتی آنسو بن کر میری آنکھوں میں رہنے لگا۔ جب وہ دل میں تھا تو خوش تھا۔ آنکھوں میں بسا تو غم بن کر نے اُسے ڈھلکنے نہیں دیا اِس صدمہ کی قدر قیمت نہ تھی کہ خاک میں جذب ہو کر اپنا وجود کھو دیتا۔

بھیا کی عادتیں رنگ لائیں اُس کی اُداسی نے بھیا کو اور زیادہ مشکوک بنا دیا وہ شاید ریشماں کو مجھ سے محبت کی سزا دینا چاہتے تھے ریشماں کا باہر آنا جانا بالکل بند کر دیا گیا حتیٰ کہ اُنھوں نے اُسے اپنے چچا یعنی ریشماں کے والد کے گھر جانے سے بھی منع کر دیا۔

ریشماں اُس دن نہ روئی نہ چلائی خاموش خاموش نگاہوں سے بھیا منصور کی لاش کی تکتی رہی اُسے سکتہ ہو گیا تھا۔ بھیا ہمارے گاؤں کے قریب برساتی پہاڑی نالے میں ڈوب کر مر گئے تھے۔ اماں نے اُس بات کا بھی بُرا منایا اُن کی نظر میں غم آنسوؤں کے بہنے کا نام تھا شاید۔ اور کچھ عرصہ بعد جب میں ریشماں سے شادی کا کہا تو وہ پھٹ پڑیں۔

ریشماں کو تو خاندان کی آبرو دقیانوسی رسم و رواج اور نفرت نے مار دیا کہ ہمارے خاندان میں عورت بیوہ ہونے پر دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ اتنا عرصہ بیت گیا ہے کسی طرح اُس کی جدائی کا زخم مندمل نہیں ہوتا۔ ریشماں کی یاد نیزے کی اَنی بن کر دل کے اندر دل کے کہیں بہت گہرائی تک اُتر گئی ہے یادوں کی راکھ میں سے بچی کھچی چنگاریوں کو تلاش کر رہا ہوں کہ جانے ابھی کب تک اِس قربان گاہ پر کس کس کی جوانی بھینٹ چڑھائی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

''کہوں کس سے میں کہ کیا ہے''

''اچھا ہوا آپ کا فون آ گیا۔ میں آپ کو کال کرنے ہی والا تھا--- حماد بھائی جیسے بھی ہو، میرا ایک کام کر دیجئے، چاہے کہیں سے بھی arrange کرو، کچھ دنوں کی بات ہے جلد واپس ہو جائیں گے''۔

میں کوئی عذر پیش کرتا مگر اُس نے دم لئے بغیر اپنی بات مکمل کر لی، یہ الگ بات کہ میں نے اس کو فون کسی اور کام کے سلسلے میں کیا تھا،

میں اُس کی پریشانی اور اندازِ بیاں کے آگے زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکا، کمبخت دل جلد پگھل گیا---!

اسی اثنا میں یاد آیا کہ ایک کرسچن سٹوڈنٹ سے وعدہ کیا تھا، آج اُس کو یونیورسٹی کی اسائنمنٹس کا طریقۂ کار سمجھانا ہے، دل میں آیا کہ اُس کی آخری تاریخ گزر گئی تو وہ میری وعدہ خلافی کے سبب مجھ سے اور میرے مذہب سے بدظن ہوگا۔ بس ملّت کا یہی درد لیے صبح دس سے بارہ بجے تک وقت اُس نوجوان کی نذر کر دیا.....!

اِس دوران میں اُسی بشر کے میسجز آتے رہے کہ کچھ کیجئے-- آج بارہ بجے تک ادائیگی کرنی ہے---

اب میں پنجاب بنک کی Mobile App سے رقم ٹرانسفر کرنے لگا----!

مگر بنک app میں بار بار خرابی--- اُدھر فون پہ فون--- کہ پیسے نہیں آ رہے---!

مگر چیک کیا تو میرے اکاؤنٹ سے رقم جا چکی ہے--- اُدھر کیوں نہیں پہنچی----!

خیال آیا کہ ابھی ہیلپ لائن پہ کال کر کے دریافت کیا جائے---!

موبائل کے سگنل کم ہونے کی وجہ سے ایک نئی جگہ (سکول) کا رُخ کیا، اکیڈمی سے باہر نکلنے کے لئے مین گیٹ کی طرف بڑھا تو دروازہ بند تھا--- باہر سے مُقفّل----!

یوں لگا کہ غلطی سے ملازم باہر سے لاک کر گیا ہے--- وہ آدھے گھنٹے بعد آیا اور یوں ہم باہر نکلے---!

سکول پہنچتے ہی سٹاف ممبر فیاض احمد نے گیٹ پر مجھے ایسے ویلکم کیا جیسے پہروں سے میرے انتظار میں ہو:-

''دراصل بہو رانی کچھ دنوں سے رُوٹھ کر میکے چلی گئی ہے---!''

گیٹ سے داخل ہوتے ہی اُس نے نہایت رازدارانہ انداز میں مجھے کان میں بتایا۔

حماد ریاض

پھر وہ آدھا گھنٹہ اپنی بہو کی کاہلی، فضول خرچی اور لاپروائی کا رونا روتا رہا اور باقی آدھا گھنٹہ اپنی شفقت، خلوص اور ہمدردی کا راگ الاپتا رہا۔

میں اُس ریڈیو صفت انسان کو سُننے کے ساتھ ساتھ اپنا کام کرتا رہا۔

اپنی کم فہمی اور ناتجربہ کاری کے باعث میں نے اُسے کسی قسم کا مشورہ دینے سے معذرت کرلی---!

اور ساتھ ہی بنک کی ہیلپ لائن کا نمبر ملالیا---!

بنک کے نمائندے نے واضح کیا کہ آپ کی شکایت درج ہوگئی ہے، رقم اگر مطلوبہ اکاؤنٹ میں ٹرانسفر نہ ہوئی تو اگلے چوبیس گھنٹوں میں آپ کے اکاؤنٹ میں واپس آجائے گی۔

میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا کہ ضرورت تو اِس وقت درپیش ہے---

اگلے چوبیس گھنٹے---!

یہ کیا بات ہوئی--- کیسا بے ہودہ نظام ہے---!

اِسی کشمکش میں دن کے دو بج گئے---

اُدھر منتظر دوست کی لگاتار فون کالز---

مزید کیا کیا جائے--- تو اب یہ سوچا کہ ایک اور دوست کو فون کیا جائے کہ وہ اپنی بنک app سے یہ کام کردے تو میں اپنی بنک app فعال ہوتے ہی رقم return کردوں گا۔

کال کرنے پر دوست نے جواب دیا کہ ہسپتال پڑا ہوں،---!

اچھا ہوا، کسی بہانے آپ نے رابطہ تو کیا---

میں شرمندہ سا ہوا--- خیر یہ کام دوست کی app سے بھی نہ ہوسکا---

دن کے تین بج گئے اور میں گزشتہ تین گھنٹوں سے پیاس بجھائے بغیر موبائل apps میں گھسا ہوا تھا---!

کوئی امید بھر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

اور ---اب تو بھوک بھی ستانے لگی۔

خود کو تسلی دی کہ ٹرانزیکشن (transaction) تو بس ہونے ہی والی ہے--- کھانا آرام سے گھر جا کے ہی کھائیں گے۔

اِسی دوران ایک کزن کا واٹس میسج آیا---

یہ سوچتے ہوئے کہ کوئی نیا لفڑا نہ کھل جائے، میں نے کزن کا میسج نہیں سنا---!

خدا خدا کر کے 12 بجے والی سرکار کو چار بجے کامیابی سے رقم ٹرانسفر ہوگئی۔

اب مجھے گھر کے لیے کچھ ضروری چیزیں لینی ہیں، سو ATM میں کارڈ ڈالا--- مگر فوراً خیال آیا کہ اکاؤنٹ کا پیٹ تو خالی ہو چکا---!

کینسل کا بٹن دبایا، کارڈ لے کر باہر نکلا---

لیکن پھر جی میں آیا کہ دیکھو تو سہی، کہیں ایسا نہ ہو کہ درویش کے خزانے میں دنیا کا مال رہ گیا ہو، اگر ایسا ہے تو فوراً نکال پھینکو---!

دوبارہ مشین کی طرف لپکا---!

لیکن اب ATM پر کوئی اور آچکا ہے---

مَیں کڑکتی دھوپ میں کھڑا محوِ انتظار---!

میں بری طرح اُکتا گیا اور اِس عبس جا بجا

سے نکلنا چاہا۔۔۔ مگر ابھی تین کام باقی تھے۔
بس آج مزید ایک ہی کام ہو گا اور
بس۔۔۔! (میں نے خود کو سمجھایا)۔
آخری کام یہ کہ چینی کی ایک بوری خرید کر
بائیک پر لادی اور گھر کو روانہ۔۔۔!
مگرررررر۔۔۔۔! چند قدم ہی چلا کہ بائیک
کی زنجیر (Chain) ٹوٹ گئی۔۔
اُفففف خدایا۔۔! آخر یہ مجھ سے ہی نویلی
چیزیں کیونکر ٹوٹ جاتی ہیں۔۔۔۔!
فطرت آخر مجھ سے کس بات کا انتقام لے
رہی ہے۔۔۔!
بہت شدت سے خود پہ رونا، بائیک پہ غصہ
اور بوری پر قہر آیا۔
مرتا کیا نہ کرتا، بوری ایک دکان پر امانتاً رکھی
اور بے آبرو سا ہو کر بائیک گھسیٹتے ہوئے
ورکشاپ کی طرف چل پڑا۔
مرمت کے دوران ذہن کو پھر خارش ہوئی؛
"کیوں نہ کزن کا وائس میسج سن لیا جائے جو
کچھ دیر قبل آیا تھا"۔
میسج سُنا تو وہ یوں تھا:
"صرف ایک ماہ کے لئے ایک لاکھ روپے کی
اشد ضرورت ہے، آج یا کل اگر رقم نہ ملی تو سودا
ہاتھ سے نکل جائے گا اور بھاری نقصان ہوگا"۔
ہائے رے رے رے رے۔۔۔!

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

(غالب)

میں اس کزن کو رپلائی کر ہی رہا تھا کہ چھوٹے
بھائی مرزا اسعد کی کال آئی کہ وہ گھر سے
دور کسی جگہ بہت الجھا ہوا ہے، اُسے اپنے
موبائل نمبر پر 500 کا لوڈ درکار ہے۔۔!
میں جواب تو پورے غضب سے دیتا مگر کیا
کیجیے، اِس کمبخت مرزے نے کچھ دن قبل
مجھ پر ایک احسان کر رکھا تھا۔
لہٰذا میں چپ چاپ اُس کے نمبر پر ایزی لوڈ
اور اپنی بائیک پہ
بوری لوڈ کر کے اپنے گاؤں کی سڑک پہ
رواں دواں ہوا۔
دھوپ ڈھل چکی تھی، موسم سہانا ہو رہا تھا،
ایسے میں کوئی خوشگوار گیت دن بھر کی ذہنی
تھکن کو کچھ کم کر سکتا تھا۔۔۔!
مگر پھر کیا ستم ظریفی ہوئی۔۔۔!
1-نغمہ سننا چاہا تو موبائل کی بیٹری قریب المرگ۔۔۔!
2-گھر پہنچا تو تاخیر سے آمد کی بابت پوچھ
تاچھ، وضاحتیں۔۔۔!
3-اور اب۔۔۔ تازہ دم ہو کر کھانا کھانے
بیٹھے تو بھوک جیسے مر سی گئی ہو۔۔!
اور ہاں۔۔! یاد آیا اِس رُوداد میں ایک اہم
ترین بات رہ گئی؛

سنانے کے قابل جو تھی بات اُن کو
وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے

(داغ دہلوی)

بات یہ ہے کہ میں آج فقط ایک درخواست جمع
کروانے کی غرض سے شہر آیا تھا جبکہ وہ درخواست
جوں کی توں میری فائل میں بند پڑی ہے۔۔۔!

☆☆☆☆☆

بند دروازہ

''ہاں جی کتنا کام باقی رہ گیا ہے؟ ارے بھائی جلدی جلدی سمیٹو، یہ نہ ہو ٹرین چھوٹ جائے''، شاہ میر کے ابا میاں گلستان خان، آستینیں چڑھائے، سانس پھلائے ہوئے گھر داخل ہوئے اور شاہ میر کی امی کے سر پر سوار ہو گئے، جو بستر کی چادریں تہہ کر رہی تھیں۔'' چادریں تہہ کر رہی ہوں، اُس کے بعد ان کو صندوقوں میں ڈالنا ہے اور تالے لگانے ہیں''، اُنہوں نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا تو ابا منہ سے بڑبڑاتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ شاہ میر کے ابا نے ایک سال قبل امریکہ امیگریشن کے لیے درخواست دی تھی، جواب منظور ہو گئی تھی اور اب یہ گھرانہ مستقل طور پہ ترکِ سکونت اختیار کر کے، امریکہ جا رہا تھا۔ ''ہاں جی! یہ بتائیں کہ گرم کمبل دو چار ساتھ میں رکھ لوں؟ وہاں نہ جانے ملیں نہ ملیں؟''، شاہ میر کی اماں گرد سے اَٹے بالوں کے ساتھ، اپنے شوہر سے مخاطب تھیں جو بریف کیس میں رکھے کاغذات کو تین تین مرتبہ پڑھ کر رکھ رہے تھے۔ وہ بار بار ایک ہی کاغذ کو یوں پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ، اتنے غور سے پڑھتے کہ گویا وہ کوئی سرکاری کاغذ نہیں بلکہ میٹرک کی انگریزی کا پرچہ ہے، جس کے سوالات اُن کی سمجھ سے باہر تھے۔ ''ارے کس دنیا میں رہتی ہو؟ وہ امریکہ ہے، تمھارا میکہ نہیں کہ جہاں کمبل نایاب ہوتے ہیں؟''، اُنہوں نے کاغذات پڑھتے پڑھتے ایک اچٹتی سی نگاہ اٹھا کر، جب یہ جواب دیا تو اُن کی بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔ ''ہاں تمہارے یہاں تو کمبلوں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے نا۔ گھر میں ایک مہمان آ جائے تو پورے گھر میں ڈھنڈیا پڑ جاتی ہے، کہ اس کو سلائیں کہاں اور کمبل کو نسا دیں۔ کیوں کہ خیر سے کوئی بھی کمبل ایسا نہیں جس پہ دس دس پیوند نہ لگے ہوں''۔ بیگم کا یہ کرارا سا جواب سُن کر وہ تلملا کر رہ گئے، مگر پلٹ کر جواب دینے کی سکت نہیں تھی، کیونکہ بات جو سچ تھی۔ ''اجی میری طرف سے جو مرضی ہے کرو۔ مجھے کاغذات مکمل کرنے ہیں، میرا سر مت کھپاؤ''، اُنہوں نے مختصر سا جواب دے کر، دوبارہ کاغذات کی ورق گردانی اُسی خشوع و خضوع کے ساتھ شروع کر دی، جیسا کہ وہ اس سے پہلے کر رہے

واجد علی

تھے، اور اماں بھی چپ چاپ کمرے سے نکل گئیں۔ ''ارے وہ شاہ میر کا بچہ کہاں ہے؟ شاہ میر، شاہ میر''، ابا نے کاغذات پڑھتے پڑھتے سر اٹھایا، اور شاہ میر کو اونچی اونچی آوازیں دینا شروع کر دیں۔ ''ارے کیوں سارے گھر کو سر پہ اٹھاتے ہو؟ یہ ساتھ والے کمرے میں تو بیٹھا ہے۔ بھیجتی ہوں میں اُسے تمہارے پاس''، اماں پھر آدھمکیں اور ابا کو چپ کرانے کے بعد، شاہ میر کے کمرے میں گئیں، جہاں وہ اوندھے منہ چارپائی پہ لیٹا ہوا تھا۔ ''ارے ناہنجار، کم بخت یہ سونے کا نہیں، کام کرنے کا وقت ہے۔ تیرے ابا کاغذات میں لگے ہیں اور میں وہاں اکیلی سارا سامان سمیٹ رہی ہوں۔ تجھے ذرا حیا نہیں آتی کہ اماں کا ہاتھ ہی بٹا دوں۔ اٹھ جا اب چارپائی سے۔ ہم تجھے چارپائی سمیت لیکر نہیں جا رہے ۔ چارپائی کو یہیں چھوڑ کر جائینگے۔'' اماں دروازے پہ ہی کھڑے کھڑے شاہ میر کو بے نقط سنا رہی تھیں، مگر وہ یوں بے حس و حرکت وہیں پڑا تھا، جیسے اُس کی روح پرواز کر چکی ہے۔ ''میں نہیں جانے والا یہاں سے۔ آپ لوگ چلیں جائیں''، اُس نے روتے روتے ماں کو بغیر دیکھے بس اتنا ہی کہا اور پھر چپ ہو گیا۔ ''احمق، نالائق، گدھا''، ماں جلی کٹی سنا کر، کمرے سے چلی گئی۔

''فروہ! فروہ بیٹی! ارے جاؤ تو میاں جی کے ہاں میلاد شریف کے چاول دے آؤ''، فروہ کی ماں، باورچی خانے میں چاول پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بیٹی کو آواز دے رہی تھی، جو ٹی وی پہ اپنا پسندیدہ ڈرامہ دیکھنے میں مگن تھی۔ ''آئی اماں!''، فروہ نے ٹی وی بند کرتے ہوئے جواب دیا، اور پھر دوپٹہ درست کر کے، ماں کے پاس باورچی خانے میں آئی۔ ''یہ لو اور دیکھو اُن سے کہنا کہ اس سال تھوڑے حالات خراب تھے، تو میلاد شریف کا ختم گھر پہ خود ہی دلوا دیا تھا۔ اللہ نے چاہا تو اگلے سال میلاد شریف بھرپور طریقے سے مناؤنگی''، ماں نے ڈش میں ڈھکے ہوئے چاول فروہ کو دیتے ہوئے نصیحت کی، تو فروہ نے سر کے اشارے سے ''ہاں'' کہا اور پھر فوراً میاں جی کے ہاں چاول دینے نکل پڑی۔

''آج شاہ میر جب میری اماں کے ہاتھ کے بنے چاول کھائے گا، تو انگلیاں چاٹتے ہوئے رہ جائے گا۔ کہوں گی کہ میں نے بنائے ہیں خود تمہارے لئے۔ ارے نہیں۔ پھر وہ سب کے سامنے میرا مذاق اڑائے گا۔ کیا کہوں گی؟ اچھا چلو چھوڑو، کہہ دوں گی، میں تمہارے لئے لیکر آئی ہوں،'' وہ وفورِ مسرت کے ساتھ، ان ہی خیالوں میں جھومتی، دل و دماغ

میں جملوں کی ترتیب سنوارتی، گرداڑاتی، شاہ میر کے گھر کی جانب جا رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے، اور محبت کے بندھن میں بندھے، ایک دوسرے کو حاصل کرنے کے شدید خواہاں تھے۔ البتہ دونوں کے گھر والے اس داستانِ محبت سے لاعلم تھے۔

''شاہ میر جلدی بیٹھو گاڑی میں''، شاہ میر کے ابا نے اُسے ڈانٹا، جو گلی میں کھڑا بار بار، اُس طرف دیکھتا تھا، جو راستہ فروہ کے گھر کی جانب جاتا تھا۔ ''اے کاش! یہ وقت تھم جائے۔ کاش!''، وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا، مگر وقت کب کسی کے لیے رکا ہے۔ اُس کا دل اس جدائی کے کرب میں شدت کے ساتھ رو رہا تھا، مگر یہ دل کے آنسو بھی ایسے نامراد ہوتے ہیں جو ہر کسی کو دکھائی بھی نہیں دیتے۔ شاہ میر کے پاؤں گویا زمین نے جکڑ لیے تھے، اور دل اُس کونج کی طرح بے قرار تھا، جو اپنے جھنڈ سے بچھڑ گئی ہو۔ دل بار بار یہی کہتا تھا کہ ابا سے سرِعام کہہ دوں کہ میں فروہ کے بغیر نہیں جاؤں گا۔ ماں سے کہہ دوں کہ اپنی محبت کو حاصل کیے بغیر نہیں جاؤں گا، لیکن یہ جملے بھی دوسری ادھوری خواہشات کی طرح کہیں بیچ میں ہی دب کے رہ گئے اور خاموش محبت کی چنگاریاں جو سینے میں آہستہ آہستہ سلگ رہی تھیں، یکدم بھڑک اٹھیں، جن کے شعلوں کی تپش اتنی شدید تھی کہ ذرا سی دیر میں اُن شعلوں نے شاہ میر کے وجود اور روح کو جلا کر بھسم کر دیا۔ اُس کا خواہشات اور امنگوں سے لبریز دل، ایک ایسی ویران حویلی بن گیا، جو صدیوں سے خالی پڑی ہو اور در و دیوار کے نقش و نگار اُڑ چکے ہوں۔ اُس کے پاؤں وہیں جمے ہوئے تھے، اور آنکھیں بار بار پلٹ کر اُس راہ کی طرف اس امید کے ساتھ دیکھتیں کہ شاید جانے سے پہلے ایک بار فروہ کا دیدار ہو جائے۔ ہونٹوں پہ خاموش محبت کا پیغام اور سینے میں جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا سیلاب، شاہ میر کی حالت اُس شخص کی سی ہو رہی تھی جس کو بے گناہ تختہ دار کی جانب گھسیٹ کر لے جایا جا رہا ہو۔

''ناہنجار! اب پیچھے کیا تیری دادی نے آنا ہے، جو یہاں بت بنا کھڑا ہے؟''، باپ نے شاہ میر کو تھپڑ رسید کیا اور پھر کھینچتے ہوئے گاڑی تک لے آئے اور زبردستی بٹھا کر دروازہ بند کیا اور ڈرائیور کو چلنے کا حکم دے دیا۔ گاڑی جب چلی تو شاہ میر کی حالت غیر ہو گئی۔ گویا کوئی زندہ انسان کی کھال اتار رہا ہو، یا کسی کی روح اذیت کے عالم میں نکل رہی ہو۔ شاہ میر نے آخری بار پیچھے مڑ کر دیکھا، اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

فروہ جب شاہ میر کے گھر پہنچی تو دروازہ بند تھا۔ اُس نے پہلے گھنٹی بجائی، مگر بعد میں اُس کی نظر دروازے پر پڑی جو مقفل تھا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنا شروع ہوگیا اور ذہن میں سو طرح کے وسوسے جاگ گئے۔ ''کہاں جاسکتے ہیں وہ؟''، وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی۔ ''آج تو میلاد شریف ہے، تو یہ سب لوگ تالا لگا کر کہاں جاسکتے ہیں؟، شاید یہ لوگ میلاد کا جلوس دیکھنے بازار گئے ہوں''، وہ اپنی چھٹی حس کے پیغام کو بار بار نظر انداز کر رہی تھی، جو اُسے خطرے کا پیغام بھیج رہے تھے۔

''ارے بیٹی! کیوں کھڑی ہو یہاں؟ یہ لوگ تو ہمیشہ کے لیے پاکستان چھوڑ کر، امریکہ چلے گئے ہیں''۔ پڑوسن نے فروہ کو بتایا، جو کسی کام سے باہر نکلی تھی۔ ''امریکہ چلے گئے؟ ہمیشہ کے لیے؟ اور مجھے بتایا تک نہیں؟، شاہ میر میرے بغیر ہی امریکہ---؟

''فروہ کو پہلے تو اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا، لیکن پھر دماغ نے سمجھایا کہ جس اندیشے کو وہ جھٹلا رہی تھی، وہ صحیح تھا۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور ہونٹ زرد ہوگئے۔ وہ کبھی حسرت وغم کی تصویر بنے میلاد کے چاولوں کو دیکھتی، تو کبھی مقفل دروازے کی جانب، جس کے کواڑ اب ہمیشہ کے لیے مقفل ہو چکے تھے۔

اُس کا سینہ اب اس قدر تنگی محسوس کر رہا تھا، کہ سانس گھٹنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر وہاں بت بنی یوں ساکت کھڑی رہی، کہ اُسے اپنے آپ اور اردگرد کا کوئی ہوش نہ تھا۔ وہ گلی، وہ بازار، وہ محلہ، وہ لوگ جو کچھ لمحے قبل تک خوبصورت محسوس ہو رہے تھے، اب گویا نگاہیں چرا رہے تھے۔ آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا چکا تھا۔ دل کی دنیا ویران، جذبات شیشے کی طرح کرچی کرچی، جبکہ امنگوں کی ساری رنگینی اور ارمانوں کا خون ہو چکا تھا۔ صدمے کا اثر اتنا گہرا تھا کہ اُس سے دو قدم چلنا بھی دوبھر ہو چکا تھا۔

''ارے بیٹی تم چاول دیئے بغیر ہی واپس آگئی؟''، ماں نے حیرت سے پوچھا، ''مگر کیوں؟''، اُنہوں نے چاول فروہ کے ہاتھ سے لیتے ہوئے شدید حیرت کے ساتھ استفسار کیا۔ ''اماں---اماں''، اُس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھ میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے، جو بس بہنا ہی چاہتے تھے۔ ماں نے جب یہ دیکھا، تو جھٹ چاول ایک طرف رکھ کر، بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ فروہ فرطِ جذبات کے ساتھ ماں سے لپٹ کر، گلوگیر لہجے میں بس اتنا ہی بولی'' اماں وہ.....دروازہ بند تھا۔''

☆☆☆☆☆

رہن رکھی انگوٹھی

اب تک آپ ایسی کہانیاں پڑھنے کے عادی ہوں گے، جن کا آغاز رومانوی قسم کے جملوں سے ہوتا ہے۔

جیسے ''نرم اور خنک ہوا چل رہی تھی۔۔۔''

یہ ایک مہکتی ہوئی گلابی شام تھی۔۔۔''

''جب ہم آپس میں ملے تو۔۔۔''

تاہم میری کہانی کا آغاز اس خوب صورت روایت سے بالکل مختلف ہے۔ یہ میری زندگی کا ایک سیاہ ترین دن تھا جب ایک سانڈ جیسے پولیس افسر نے ہتھکڑیاں ڈال کر مجھے حوالات میں دھکیل دیا۔ مجھے جس تھانے میں بند کیا گیا، وہاں شدید سردی تھی، تھانے کے عملے کے چہروں سے بھی سرد مہری عیاں تھی۔ سچ پوچھیں تو مجھے بچپن ہی سے پولیس والوں کی شکل دیکھنے سے نفرت رہی ہے۔ انھیں بھی میرے جیسے بے گھر مزدور سے کیسے محبت ہوسکتی ہے۔ جو ان کے کسی کام کا نہیں۔ اگر دیکھیں تو میرے زندہ دل اور بااخلاق ہونے کی وجہ سے زیادہ تر لوگ مجھ سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ انھیں میرا علم اور حِلم پسند ہے، لیکن ایک پولیس والا میرے جیسے عام آدمی کو کیسے ایک قابل ذکر شخصیت جان سکتا ہے۔

ہمارے علاقے کا پولیس اسٹیشن گاؤں کے مرکزی چوک میں واقع ہے۔ جس گلی سے مجھے گرفتار کیا گیا، وہ اس چوک سے تقریباً پانچ سو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ مکروہ اور کریہہ شکل والے پولیس افسر نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی اور دھکا دیتے ہوئے غصے سے چلایا!

''تیزی سے قدم اٹھاؤ''!!

مجھ سے چپ نہیں رہا گیا، میں نے جواب میں کہا۔

''مرو تم! اللہ تمھاری اپنی زندگی کا سفر تیز کرے، تاکہ موت کی منزل تک آسانی

ریاض حسین محمود
مترجم: محمد افتخار شفیع

سے پہنچ سکو"

میری بات سن کر اس نے زور سے اپنی لات میری کمر پر رسید کی۔ اس کے بدلے میں، مجھ سے کچھ نہ ہو پایا تو انتقامی کارروائی کے طور پر میں نے بھی اپنی پیشانی اسی زور سے زمین پر دے ماری۔

"تمھیں کم از کم بدلہ لینے کا طریقہ مجھ سے سیکھنا چاہیے"

قانون نافذ کرنے والے غیر قانونی شخص نے مجھے ایک اور لات رسید کی۔ جوابی حملے کے طور پر میں نے بھی اپنی لات زمین پر دے ماری۔

"کیا ہم سب مٹی کے بنے ہوئے نہیں ہیں؟ اور ہم نے کیڑے مکوڑوں کا رزق نہیں بننا؟"

میں نے زمین پر تھوکا اور اس جگہ کو اپنے پاؤں کی ایڑی سے مسل دیا۔

پولیس افسر نے میری ہتھکڑی کو مزید کس دیا، وہ سختی سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

میں نے پولیس والے کی شکل کو غور سے دیکھا۔ وہ مجھے ہجیری کا ہم شکل لگا۔ آپ ہجیری کو نہیں جانتے، یہ وہی شخص تھا جس کا میں نے فاقہ کشی کی حالت میں گدھا چرایا تھا، میں آسانی سے اپنا کام کر چکا تھا۔ وہ تو موت آئے اس کی بیوی کو جو بے وقت نیند سے بیدار ہو گئی اور اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ شور کی آوازیں سن کر لوگ اکٹھے ہو گئے اور میرا پول کھل گیا، تو میں یہ کہہ رہا ہوں: یہ پولیس والا بھی ہجیری کی طرح تنگ پیشانی والا تھا، بالکل جیسے کسی یتیم بچے کی تنگ پیشانی ہوتی ہے۔ میرے پاؤں کی انگلیاں میرے جوتوں سے باہر نکل رہی تھیں۔

یہ صورت حال میرے لیے خاصی پریشان کن تھی۔ میں وہاں سے فرار ہونے کا سوچنے لگا، میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ خدانخواستہ اگر میں فرار کی اس کوشش میں ناکام ہو جاتا تو پھر مجھے ساری عمر جیل میں گلتے سڑتے ہوئے گزارنا پڑتی تھی۔ میری بے گناہی سے کسی کو کوئی غرض نہ تھی۔ قانون اندھا ہوتا ہے اور عدالت بھی اس قانون کی پابند ہوتی ہے۔ ایک جج ہر معاملے میں تحریر شدہ دستاویزات کو سامنے رکھتا ہے، ثبوت مانگتا ہے، چاہے وہ جھوٹ کا پلندہ ہی کیوں نہ ہوں۔

میں چوں کہ پاگلوں کی جنت میں رہتا ہوں اس لیے مکمل طور پر اپنے حواس کھو چکا ہوں، اب مجھے اقراری مجرم قرار دے دینا چاہیے۔ کیوں کہ مجھے اب اپنے کسی بھی جرم کا اقرار کرتے ہوئے ذرا بھی خوف

یا شرمندگی نہیں ہوتی۔ مجھے پانچ سال کی سزا تو اپنی پہلے جرم پر مل سکتی تھی، وہی گدھا چرانے کا جرم۔

دوسرا جرم یہ تھا کہ میں نے مُکا مار کر صرافہ بازار کے ایک سود خور جیولر کے اگلے دو دانت توڑ دیے تھے۔ اس نے اپنی دکان پر میری بیوی کی شادی کی رہن رکھی ہوئی سونے کی انگوٹھی واپس کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ مجھے ادھار لی گئی رقم واپس کرنے میں کچھ تاخیر ہو گئی تھی لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا، میرے پولش نسل کے اسرائیلی مالک نے مجھے تنخواہ دینے میں اچھی خاصی تاخیر کر دی تھی۔ میرے اس جرم کی سزا بھی کم از کم پانچ سال ملے گی۔

اس وقت مجھے اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کی یاد بھی آ رہی تھی، مجھے ان دونوں سے سخت نفرت ہے۔ بچے سے خاص طور پر، کیوں کہ وہ سخت سردی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی پیدائش کے دوسرے ہی دن، میں ایک لانڈری سے بچوں کا اونی کمبل چراتے ہوئے پکڑا گیا تھا، لانڈری کے بڑی توند اور بھاری جیب والے مالک نے میرے خلاف شکایت کر دی تھی۔ اتنے بڑا جرم کی سزا کم از کم عمر قید تو ہوتی ہے۔

سچ پوچھیے تو میں اب پاگلوں کی طرح ہر جرم کو تسلیم کرنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ اس وقت میری دلی خواہش تھی کہ اپنی بیوی سے ملوں اور اسے اس خفیہ جگہ کے بارے میں بتاؤں جہاں میں نے ان جرائم سے حاصل ہونے والا اربوں روپے کا مال چھپایا ہوا ہے، تاکہ وہ میری اسیری کے دنوں میں اپنی اور بچے کی کفالت کر سکے۔

پولیس اسٹیشن کا فاصلہ اب دو سو میٹر رہ گیا تھا۔ میں نے کنکھیوں سے پولیس افسر کی جانب دیکھا تو وہ بڑی حقارت سے میری ہی طرف متوجہ تھا۔ میں نے کسی میمنے کی طرح لجاجت سے گزارش کی:

''کیا تم مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہو، میں اس کے بدلے میں تمھیں دس پاؤنڈ دوں گا؟''

''مجھے میرے بیوی بچوں کی قسم میں اپنا وعدہ پورا کروں گا''۔

''مجھے تھوڑی دیر کے لیے گھر جانے دو، میں واپس آ جاؤں گا''

''تم ایک پولیس والے کو رشوت دے رہے ہو، اس کی سزا جانتے ہو؟ یہ تو بہت بڑا جرم ہے''

یہ بات کر کے اس نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ ہتھکڑی کی وجہ سے مجھے بھی تیز تیز چلنا پڑا۔

راستے میں سڑک پر گاڑیوں کا تیز شور تھا، فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والوں کی کثرت تھی۔

"اوہ میرے خدا! بے جان مشینوں کو سڑکوں پر چلنے کی پوری آزادی ہے، ایک انسان ہے جو اس ملک میں نسل در نسل غلام بنا لیے گئے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم کر دیا گیا ہوں۔ میری آزادی کی کوئی قدر نہیں، میری نجی زندگی سے کسی کو کوئی دل چسپی نہیں۔

میں عدالت میں موجود جج کو کیسے اس بات کا قائل کر سکوں گا کہ مجھے اس معاشرے نے مجبور اور پاگل بنا کر مجھ سے میری انسانیت چھین لی ہے۔

میں نے اپنی بیوی اور بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے گدھا چوری کیا، کیوں کہ میں پاگل تھا۔

میں نے اپنے شیر خوار بچے کو سردی کی شدت سے بچانے کے لیے کمبل چوری کیا۔ کیوں کہ میں پاگل تھا۔

میں نے لڑائی میں جیولر کے دو دانت اس لیے توڑ دیے تھے کہ وہ اپنے پاس رہن رکھی ہوئی میری انگوٹھی واپس نہیں کر رہا تھا، اس دن وہ انگوٹھی بیچ کر میں اپنے گھر کا راشن لینا چاہتا تھا۔ میرے بیٹے کو سکول کی نئی وردی چاہیے تھی اور میری بیوی کا جوتا پرانا ہو کر بھدا بن گیا تھا۔

ہم پولیس اسٹیشن کے قریب پہنچے تو میں پوری طرح اپنے مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا، اب کوئی بھی یہاں میری ضمانت دینے کے لیے نہیں آئے گا، شاید میرے بیوی بچوں کو بھی مجھ سے ملنے کی اجازت نہ ہوگی۔ مجھے زندگی کے بچے کھچے دن ایک بدبودار قید خانے میں گزارنے پڑیں گے۔ تاریک اور ویران قید خانہ۔

میں خیالوں کے یہ تانے بانے بُن ہی رہا تھا کہ اچانک دور سے تیز روشنی چمکی جس سے ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ یہ ایک تیز رفتار کار کی ہیڈ لائٹس تھیں، جو بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ آن واحد میں وہ ہمارے قریب آن پہنچی۔ میں نے موقع دیکھتے ہی پولیس والے کو جو میرے آگے آگے چل رہا تھا، زور سے گاڑی کی طرف دھکا دیا۔ مجھے اس کی خوف ناک چیخ سنائی دی۔ تیز رفتار کار کی ٹکر سے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے ہتھکڑی اتاری اور تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔

اب میں ہتھکڑی سے زخمی ہونے والی اپنی کلائی پر مرہم پٹی کروانے کے لیے ہسپتال میں موجود ہوں، اور یہاں اپنے بیوی اور بچوں کا انتظار کر رہا ہوں۔

☆☆☆☆☆

کارِ خیر

وہ ڈوبتے سورج کی روشنی جو اپنا دن بھر کا سفر مکمل کر کے مدھم ہونے کی طرف تھی، وہیں پرندوں کی تھکن بھری چہچہاہٹ بھی ماحول کو خوش گوار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ میں اپنے گھر کی بالکونی میں بیٹھے ان پرندوں کی بھاگ دوڑ دیکھنے میں مصروف تھی جنھیں گھر جانے کی بے چینی تھی، وہیں ایک تھکاوٹ بھرا دن گزار کر اپنوں سے ملنے کی خوشی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ جانے انجانے میں بھی اپنا موازنہ ان پرندوں سے کر رہی تھی کہ چند گھنٹوں بعد ہی سہی پر وہ اپنے ماں باپ، سے کوئی اپنے بچوں سے مل لے گا۔ یہ دوری تو بس مختصر سی ہے پر میں.. میرا انتظار تو آخرت تک ہے۔ میں کب پرسکون انداز میں اپنے ماں باپ کو دیکھ سکوں گی۔ کیا ہی اچھا ہوتا اللہ تعالیٰ ان کو کچھ مزید وقت کے لیے میرے پاس رہنے دیتا۔ اللہ کو تو سب پتا ہے اس کے بندے ماں باپ کے بنا ادھورے ہوتے ہیں پھر وہ کیسے اپنے بندوں کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔

میں اپنی انہی سوچوں میں گم تھی جب اذان کی آواز پہ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، آسمان کا رنگ بدلتا دکھائی دیا تو اندھیرے سے خوف زدہ ہو کر میں نے اپنا اسٹول سنبھالا اور اندر کی جانب بڑھی۔ کمرے میں آتے ہی میسج نوٹیفکیشن کی جانب متوجہ ہوئی جہاں میری دوست نے کل ہونے والے سیمینار میں شرکت کی دعوت کے ساتھ لوکیشن اور ٹائمنگ میسج کی تھی۔

''یار میں جا کے کیا کروں گی؟ میرا موڈ نہیں ہے''، میں نے کوفت سے جوابی میسج سینڈ کیا۔

''عارش علی ایک نامور تھراپسٹ اور پبلک اسپیکر ہیں۔ کل وہ اس سیمینار میں شرکت کرنے آ رہے ہیں۔ جتنے بہترین اور کامیاب وہ تھراپسٹ ہیں اس سے کہیں اچھے اسپیکر ہیں۔ انہیں اپنے لفظوں سے لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنا آتا ہے۔ کئی معروف ہستیاں ان کی مداح ہیں۔ تم ایک بار چل کر تو دیکھو''، چند سیکنڈز گزرے تھے کہ میری دوست کی طرف سے میسج موصول ہوا۔ چند پل بے زاریت سے میسج دیکھنے کے بعد کچھ سوچتے ہوئے میں نے ''اوکے'' کا ریپلائی دیا اور معمول کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔

''ایک شخص فقط بول کر کیسے لوگوں کو ہیل کر سکتا ہے۔ امید کی باتیں کرنے والے تو بہت ہیں لیکن ہاتھ تھام کر اندھیروں سے نکالنے والا کہیں نہیں ملتا''، اس نے سر جھٹکا تھا۔

اگلے دن کا سورج ایک نئی صبح، ایک نئی زندگی، ایک نئی امید کا پیام لے کر طلوع ہوا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی بے دلی سے تیار ہو رہی تھی۔ اگلے چند گھنٹوں میں وہ اپنی دوست کے ساتھ ایک بڑے

طوبیٰ صدیقی

سے کھچا کھچ بھرے ہال میں موجود تھی۔ یہ سب لوگ اس ایک شخص کو سننے کے لیے آئے ہیں۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ اس نے گردن گھما کر آس پاس دیکھا، پورا ہال لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور پھر اچانک مائیک پہ ان کی آمد کا بتایا گیا۔ اس نے بیگ سے موبائل نکال کر وقت دیکھا انہیں یہاں آئے ہوئے پچیس منٹ ہو چکے تھے۔

''جو شخص وقت کا پابند نہ ہو پھر وہ چاہے کتنی ہی خوبیوں کا مالک ہو کوئی فائدہ نہیں''، اسے اب خود پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ یہاں آئی ہی کیوں۔

''السلام علیکم!'' اس کی آواز ہال میں گونجی تھی اور یکلخت پورے ہال میں سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ اس نے موبائل سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھا۔ چہرے پر نرم سی مسکراہٹ لیے اس نے بولنے کا آغاز کیا۔ بڑی سی پراجیکٹر اسکرین پر بھی اس کا عکس دکھائی دے رہا تھا اور وہ اردگرد سے بے نیاز بس اسے سن رہی تھی۔ وہ اس کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ اس کی آواز ٹھنڈے پانی کی پھوار جیسی تھی اور اس کی مسکراہٹ گرمی کی سخت دوپہر کی ٹھنڈی شام جیسی۔ وہ سوچنے لگی۔ وقت گزرنے کا علم نہیں ہوا۔ وہ دو گھنٹے سے مسلسل ایک ایسے شخص کو سن رہی تھی جس کے بارے میں یہاں آنے سے پہلے وہ نہ جانے کیا کچھ سوچ چکی تھی۔

''کیا ہم ان سے مطلب ہے عارش علی سے مل سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا

''ہاں کیوں نہیں، وہ سیمینار کے بعد ملاقات بھی کرتے ہیں، آؤ مل لیتے ہیں''، زارا میری دوست جو میرے اس سوال پہ خوش ہوئی تھی وہ مجھے لیے اسی کمرے کی جانب بڑھی جہاں سے ابھی ہم نکلے تھے۔

''السلام علیکم سر! یہ میری دوست ہے۔ یہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے اگر آپ چند منٹ اس کی بات سن لیں تو..'' زارا نے ان کے پاس جا کے گزارش کی تو انھوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

''وعلیکم السلام جی ضرور، آپ لوگ پلیز یہاں بیٹھیں۔ میں ذرا دو منٹ میں آیا''، کمرا تقریباً خالی ہو چکا تھا ہم ڈائس کے قریب ہی رکھی کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔

''چلو تم بات کرلو، میں آتی ہوں پانی پی کے''، زارا نے انہیں واپس آتا دیکھ کر مجھ سے کہا اور اٹھ کر باہر کی جانب بڑھ گئی۔

''کیا آپ کوئی بات کرنا چاہ رہی تھیں؟'' وہ وہاں ٹیبل پہ موجود اپنا لیپ ٹاپ اور موبائل چارجر وغیرہ سمیٹ کر بیگ میں رکھ رہے تھے کہ انھوں نے مجھے بہت عام سے انداز میں مخاطب کیا۔

''نہ۔۔ نہیں۔ وہ تو بس زارا نے کہا..'' ان کے سوال پہ ہکلاتے ہوئے بے ترتیب لفظوں میں کہا۔

''جی آپ کی دوست نے کہا تھا آپ کچھ بات کرنا چاہتی ہیں۔ آپ سب سے پہلے اپنا نام بتائیں''، وہی دھیمی مسکراہٹ جوان کی شخصیت کا حصہ تھی انھوں نے ہونٹوں پہ سجاتے ہوئے پوچھا اور میرے سامنے موجود رکھی کرسی پہ بیٹھ گئے۔

''میرا نام عرشیہ ہے''، میں نے جھجکتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی مٹھی بناتے ہوئے گود میں رکھے اور اپنا نام بتایا۔

''بہت اچھا نام ہے، چلیں اب بتائیں آپ کس

الجھن کا شکار ہیں اور آپ اس سے پہلے کوئی سوال کریں میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ میں کوئی جادوگر نہیں جسے جادو سے سب پتا چل جائے مجھے آپ کی آنکھوں میں سوال نظر آیا تو بس آپ کے اس سوال کے جواب دینے کے لیے خود کو آپ کی خدمت میں حاضر کر دیا''، انھوں نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے ایسے لفظوں کا انتخاب کیا کہ میں بغیر کسی جھجک کے ان سے بات کر سکوں۔

''تھینک یو سو مچ سر، میرے بابا کے بعد آپ واحد شخص ہیں جنھوں نے میری الجھن میری آنکھوں میں پڑھ لی۔ مجھے کبھی کوئی مسئلہ ہوتا یا کوئی بات یا کوئی سوال یا کچھ بھی میرے بابا ایسے ہی میری آنکھیں پڑھ لیا کرتے تھے اور یونہی میری بات سمجھ کر میرے مسئلے کا حل نکال دیا کرتے پر اب مسئلہ یہی ہے کہ میرے پاس میرے بابا ہی نہیں رہے، میری ماما تو پہلے ہی ہمیں چھوڑ گئی تھیں اور اب بابا بھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں ایسا کیا کروں کہ مجھے سکون آ جائے...''، میری آواز میں بھاری پن اور آنکھوں میں نمی دیکھ کر انھوں نے پانی کا گلاس میری جانب بڑھایا۔

''آپ اپنے بابا سے بہت پیار کرتی ہیں نا؟'' دھیمے لہجے میں پوچھا گیا سوال مجھے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر گیا۔ ان کی براؤن آنکھوں میں نہ جانے کون سی کشش تھی کہ میں چند پل انھیں دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

''جی'' اپنی بے ساختگی کا احساس ہوا تو فوراً ہی نظریں پھیرتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا آپ کو پتا ہے آپ کے بابا کی سب سے اچھی عادت کیا تھی؟''

''جی، میرے بابا بہت نیک اور رحم دل تھے۔ ہر کسی کی مدد کو تیار رہتے، کسی فقیر کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے، کبھی کسی کو روٹھنے نہیں دیتے تھے''، بابا کے بارے میں بات کرتے ہوئے میری آنکھوں میں ایک خاص چمک آئی تھی۔

''زبردست، یہ تو بہت نیکی کا کام ہے۔ اب آتے ہیں آپ کے سوال کی طرف کہ آپ کو سکون کیسے ملے گا۔ آپ اپنے بابا کی ان عادتوں کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ جب تک جیسے جہاں ممکن ہو لوگوں کی مدد کریں، ضروری نہیں مدد پیسوں سے کی جائے۔ ہم کسی کے سامع بن سکتے ہیں کہ اس کو سن لیں اس کے دل کا غبار نکل جائے۔ کسی کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھ سکتے ہیں کہ شاید ہماری مانگی گئی دعا اس کے حق میں قبول ہو جائے۔ تو کسی کو ان لفظوں کے ذریعے امید کا دیا تھما سکتے ہیں''، انھوں نے نرم اور حلاوت سے بھرپور لہجے میں کہتے ہوئے مجھے بھی امید کا ایک دیا تھمایا۔

''کیا واقعی اس سے مجھے سکون ملے گا؟'' مجھے حیرت ہوئی ایسی بات تو ابھی تک کسی نے نہیں کہی تھی، پچھلے چھ ماہ سے سب مجھے دلاسے دیتے، آنے والے وقت سے ڈراتے تھے کہ اکیلی لڑکی کی زندگی کس قدر مشکل ہو گی۔ اور آخری حل بس شادی کا ہی نکال کر میرے سامنے رکھ دیا کرتے تھے۔

''آپ یقین کے ساتھ کوشش کر کے دیکھیں۔ اپنے بابا جیسے بننے کی کوشش کریں۔ کسی کے لیے نہیں کر سکتیں اپنے لیے کریں پتا ہے جب تک ہماری یہ سانسیں چل رہی ہیں ہمیں جینا ہے۔ تو کیوں روپیٹ کے زندگی کے ان خوب صورت اور اچھے دنوں کو برباد کیا جائے۔ ان کو

اچھی یاد کیوں نہ بنایا جائے، کسی نیک کام، نیک مقصد کی خاطر اس زندگی کو گزارا جائے''، میں حیرانی سے اسے سن رہی تھی، مجھے تو ابھی تک تنہا زندگی سے ڈرایا جا رہا تھا یہ کون تھا جو مجھے خوب صورت زندگی گزارنے کا گر سکھا رہا تھا۔

''پر یہ سب بہت مشکل ہے''، میں نے اپنے اندر کے ڈر کو مشکل کا نام دیتے ہوئے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''مسئلہ تو سنگین ہے۔ آپ کو پتا ہے آپ کی تربیت بہت اچھی ہوئی ہے۔ آپ کی سوچ بہت پختہ ہے۔ آپ کے بابا نے آپ کو ایک مضبوط شخصیت بنایا ہے اور آپ کو مسائل سے نکلنے کا راستہ بھی بتایا ہے۔ بتایا ہے نا؟'' اس نے بچوں کی طرح بہلاتے ہوئے آخر میں سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی بابا کہتے تھے جب بھی کوئی پریشانی ہو، کوئی مسئلہ ہو اللہ پاک سے کہو وہ سنتا ہے اور ہماری مدد بھی کرتا ہے۔ کامل یقین ہونا چاہیے اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنی مدد آپ کے تحت اپنی سے ہر ممکن کوشش کرو''، مجھے بابا کے کہے الفاظ یاد آئے تو میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بالکل صحیح، بس تو آپ کو یہی کرنا ہے اپنے اس مشکل کام کے لیے اللہ سے مدد مانگنی ہے۔ اور باقی راستے وہ خود بنائے گا...''

''جیسے آج اس نے آپ کو وسیلہ بنایا''، میں آہستہ آہستہ ہی نگران کی بات سمجھ رہی تھی۔ میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگے۔

''آپ تو بہت سمجھدار ہیں بھئی، چلیں آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے، اب میں چلتا ہوں کچھ ضروری کام ہیں۔ اللہ حافظ!''، وہ گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میں اس کمرے سے نکلی تو میری الجھن کسی حد تک سلجھ چکی تھی۔ مجھے سمجھ آ گئی تھی کہ مجھے بابا کو یاد کر کے رونا نہیں بلکہ ان کے نیک کاموں کو زندہ رکھنا ہے۔ ان کی یاد میں اداس ہونے کے بجائے ان کے لیے دعا کرنی ہے یہ سب باتیں مجھے معلوم تھیں پر وقتی طور پر دماغ قفل زدہ ہو گیا تھا، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ میں زندگی سے ڈرنے لگی تھی پر اس ملاقات نے مجھے پرسکون کر دیا تھا۔ میں گھر لوٹی تو سوچوں سے آزاد تھی، موبائل پر فیس بک کھولتے میں نے عارش علی کا فیس بک پیج سرچ کیا جس کے بائیو میں یہ لائنز درج تھیں۔

''کوئی ہمارے پاس مدد کے لیے اسی لیے آتا ہے کہ اسے ہم سے امید ہوتی ہے کہ ہم اس کی مدد ضرور کریں گے۔ زندگی میں کبھی کسی کی مدد کا موقع ملے تو اس کارِ خیر میں پیش پیش رہیں کہ اس کارِ خیر کے لیے مالک کائنات نے لاکھوں لوگوں میں سے ہمیں چنا ہے''۔

ان لائنز کو پڑھ کر میرے دل میں عارش علی کے لیے عزت اور بڑھ گئی تھی، میں نے ان لائنز کو کاپی کر کے اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔

وہ میری زندگی کی حبس زدہ شام میں ہوا کی جھونکے کی مانند آئے تھے، جہاں ذرا سی ہوا ہی سکون کا باعث ہو، ہر گلی بند دکھائی دے، ہر دروازہ قفل زدہ ہو ایسے میں کسی مثبت شخصیت کا مل جانا بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔

☆☆☆☆☆

غزل

خالد احمد

محفلِ ماہتاب میں نجمِ سحر نہیں تو کیا
لاکھ نیاز مند ہیں ، ایک اگر نہیں تو کیا

دل بھی ترا دیار تھا اور تُو شہریار تھا
شہر کا شہر جل بجھا ، تجھ کو خبر نہیں تو کیا

ہم بھی مہِ دو نیم ہیں، ہم بھی ترے ندیم ہیں
کارِ وفا اگر ترے پیشِ نظر نہیں تو کیا

ہم تری سمت کب بڑھے، ناک کی سیدھ چل پڑے
بے طلبی کی راہ میں ، کوئی شجر نہیں تو کیا

ہاتھ میں اپنا ہاتھ ہے اور ہوا کا ساتھ ہے
پیشِ نگاہِ گمرہی ، وجہِ سفر نہیں تو کیا

کب مہ و سال رُک چلے، شاخِ مثال جھک چلے
بارِ مہ و نجوم ہے ، بارِ ثمر نہیں تو کیا

گورِ غبار ہی سہی، چھت تو سروں کو چاہیے
شہر میں گھر نہیں تو کیا، جسم پر سر نہیں تو کیا

ہجر کا غم کچھ اور ہے، آنکھ کا نم کچھ اور شے
زیرِ چراغِ آگہی نورِ ہنر نہیں تو کیا

غزلیں

دل کی بات نہ مانی ہوتی عشق کیا کیوں پیری میں
اپنی مرضی بھی شامل ہے اپنی بے توقیری میں

درد اٹھا تو ریزہ دل کا گوشۂ لب پر آن جما
خوش ہیں کوئی نقش تو ابھرا بارے بے تصویری میں

قید میں گل جو یاد آیا تو پھول سا دامن چاک کیا
اور لہو پھر روئے گویا بھولے نہیں اسیری میں

جانے والے چلے گئے پر لحہ لحہ ان کی یاد
دکھ میلے میں انگلی تھامے ساتھ چلی دل گیری میں

طوق گلے کا پاؤں کی بیڑی آہن گر نے کاٹ دیے
اپنے آپ سے باہر نکلے زور کہاں زنجیری میں

شکر ہے جتنی عمر گزاری نان و نمک کی فکر نہ تھی
ہاتھ کا تکیہ خاک کا بستر حاصل رہے فقیری میں

توصیف تبسم

سنو کوی توصیف تبسم اس دکھ سے کیا پاؤ گے
سپنے لکھتے لکھتے آخر خود سپنا ہو جاؤ گے

جلتی آنکھوں جوالا پھوٹے خوشبو گھل کر رنگ بنے
دکھ کے لاکھوں چہرے ہیں کس کس سے آنکھ ملاؤ گے

ہر کھڑکی میں پھول کھلے ہیں پیلے پیلے چہروں کے
کیسی سرسوں پھولی ہے کیا ایسے میں گھر جاؤ گے

اتنے رنگوں میں کیوں تم کو ایک رنگ من بھایا ہے
بھید یہ اپنے جی کا کیسے اوروں کو سمجھاؤ گے

اب تو سحر ہونے کو آئی اب تو گھر کو لوٹ چلو
چاند کے پیچھے پیچھے جتنا بھاگو گے گہناؤ گے

دل کی بازی ہار کے روئے ہو تو یہ بھی سن رکھو
اور ابھی تم پیار کرو گے اور ابھی پچھتاؤ گے

غزل

وعدہ جو تھا نباہ کا تم نے وفا نہیں کیا
ہم نے تو آج تک تمہیں دل سے جدا نہیں کیا

ہم ہی وہ کم نصیب تھے مانگے ملی نہ موت بھی
آپ کا کیا قصور ہے آپ نے کیا نہیں کیا

موم ہوئے پگھل گئے سنگ بنے چیخ گئے
پھر بھی زباں سے آج تک ہم نے گلہ نہیں کیا

دشت طلب میں ہر صدا گونج بنی بکھر گئی
کس کو سلگتی ریت نے آبلہ پا نہیں کیا

وہ تو یہ کہیے سخت جاں ہم تھے کہ وار سہہ گئے
تم نے وگرنہ ایک بھی تیر خطا نہیں کیا

آج وفا کا واسطہ دیتا ہے وہ ستم ظریف
جس نے غرور حسن میں خوف خدا نہیں کیا

ویسے تو سب بزعم خویش سچے ہیں لین دین کے
مٹی کا جس پہ قرض تھا اس نے ادا نہیں کیا

مرتضیٰ برلاس

غزل

ہمارے سامنے جیسے رہے ہیں
وہ ہر کردار میں اچھے رہے ہیں

وہ دولت سے خزانے بھر رہے تھے
ہم اپنے داغ ہی چنتے رہے ہیں

ضرورت مند پیچھے رہ گئے تھے
مگر ہم سر پھرے آگے رہے ہیں

رکاوٹ آپ نے ڈالی ہوئی تھی
ہمارے قافلے بڑھتے رہے ہیں

بھریں ہر لفظ میں وہ درد دل کا
جو شاعر مرثیے لکھتے رہے ہیں

دیا تھا حوصلہ یاروں نے مجھ کو
وہی میرا بھرم رکھتے رہے ہیں

جہاں ثاقب حقارت ہو زباں پر
بہت ناکام وہ جلسے رہے ہیں

آصف ثاقب

غزل

شکستِ خواب پہ دل اتنا ہارنا نہیں ٹھیک
زرِ رجا کو لحد میں اتارنا نہیں ٹھیک

کسی جہت میں تو کر زندگی کو بامعنی
گزر رہی ہے یہ جیسے، گزارنا نہیں ٹھیک

یہ دیکھ لوگ تجھے کس نظر سے دیکھتے ہیں
خود اپنے آپ کو برتر شمارنا نہیں ٹھیک

وہ پھر کسی کے بھی قابو میں رہ نہیں سکتا
ہجومِ خلق کو حد سے ابھارنا نہیں ٹھیک

فرار کا کوئی رستہ تو ہو عدو کے لیے
ہر ایک سمت سے اس کو ھکارنا نہیں ٹھیک

ہو سامنے رہِ امکاں نئی تو سوچنا کیا
ہے ٹھیک یا یہ سفر اختیارنا نہیں ٹھیک

مبالغے میں بھی عالی لحاظِ حد کچھ تو
جو آٹھ دس پہ ہو اُس کو ہزارنا نہیں ٹھیک

جلیل عالی

غزل

نغمہ و سازِ تار نفس بیچ کر
مئے خریدی ہے پھولوں کا رس بیچ کر

گل فروشو! بہار آنے والی نہیں
اب گزارا کرو خار و خس بیچ کر

اپنی مٹھی میں تھے یہ زمان و مکاں
دست بستہ ہوئے دسترس بیچ کر

آ گیا وہ بھی صیاد کے ہاتھ میں
گھر بنایا تھا ہم نے قفس بیچ کر

میری حق گوئیاں ، میری خود داریاں
کھا گیا خوف اہل ہوس ، بیچ کر

بھوک سے بلبلاتی ہوئی خلق میں
بانٹ دو معبدوں کے کلس بیچ کر

رہنما کے اشاروں پہ مت جایئے
مار ڈالے گا بانگِ جرس بیچ کر

آج پھر یاد ماضی سے پالا پڑا
چند لمحے خریدے برس بیچ کر

اس برس کے خریدے ہوئے غم کنور
موج اڑائیں گے اگلے برس بیچ کر

اعجاز کنور راجہ

غزلیں

کیوں نہ دم بہ دم آئے اس کو پیار دھرتی پر
زینتِ دو عالم ہے اس کا یار دھرتی پر

جیسے اُن کے بس میں ہو آسماں کا چھو لینا
سر اُٹھائے پھرتے ہیں شہریار دھرتی پر

چار دن کی مہماں ہے آنکھ کی یہ طغیانی
نقش کوئی کب ٹھہرا پائیدار دھرتی پر

جائیں تو کہاں جائیں بے بسی کے عالم میں
دل زدہ ہیں ہم ایسے بے شمار دھرتی پر

بے لگام طاغوتی سر اٹھائے پھرتے ہیں
پھیلتا ہی جاتا ہے انتشار دھرتی پر

حوصلہ نہ ہاریں گے دہر کے خرابے میں
زندگی گزاریں گے باوقار دھرتی پر

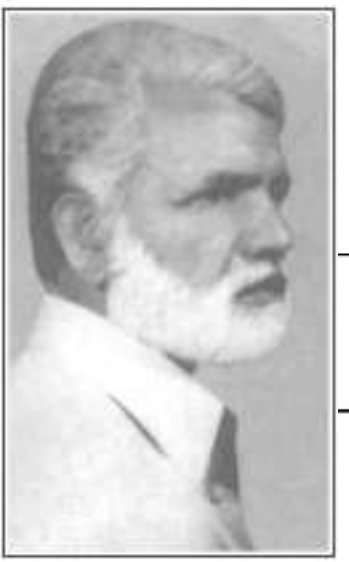

یعقوب پرواز

گماں آخر ہمارا کام آیا
فضاؤں میں غبارہ کام آیا

بھنور کی آخری ہچکی سے پہلے
کہاں کوئی کنارا کام آیا

رہینِ شہرتِ فرہاد ٹھہرا
کبھی یوں بھی خسارہ کام آیا

کہیں ابہام نے جادو جگایا
کہیں پر استعارہ کام آیا

کلام اُس کی سماعت میں نہیں ہے
اُسے جب بھی پکارا ، کام آیا

گواہی دے رہی ہیں بھیگی پلکیں
دل اپنا پارہ پارہ کام آیا

نظر تھی جس قدر پرواز گہری
سو اُتنا ہی نظارہ کام آیا

غزلیں

کہہ رہا ہے سبھی احوال مرے سینے کا
زنگ دیوار تک آیا ہُوا آئینے کا

زندگی ! تیری رفاقت کا یہ حاصل نکلا
ڈھنگ مر مر کے ہمیں آ ہی گیا جینے کا

دل نے ہی راہ دِکھائی مجھے ہر مشکل میں
کیوں نہ اَب ہاتھ پکڑ لوں اِسی نابینے کا

کبھی مشکیزے سے بھی پیاس بجھا لیتے تھے
اَب تو دریاؤں کا پانی بھی نہیں پینے کا

لوٹ کر جاتے ہُوئے چپکے سے جانا خاورؔ
چھت پہ احوال نہ کُھل جائے کہیں زینے کا

خاور اعجاز

ایک نقطے پہ کبھی جذبۂ صادق نہ مِلا
کبھی عذرا نہ مِلی اور کبھی وامق نہ مِلا

تیری دُنیا میں بہت گھوم کے دیکھا لیکن
کوئی صحرا مری وحشت کے مطابق نہ مِلا

عشق کے باب میں ہم اکمل و کامل نکلے
اِک مرض ایسا نہ تھا جو ہمیں لاحق نہ مِلا

دعویٰ سمت شناسی تھا جنھیں اُن کو بھی
کبھی مغرب نہ مِلا اور کبھی مشرق نہ مِلا

برگِ آوارہ کی صورت رہے ہم خوار و زبوں
ایک جھونکا بھی ہمیں اپنے موافق نہ ملا

غزل

اَور سب کو سُنائی دی دستک
پر مُجھے تو دِکھائی دی دستک !

عُمر بھر مَیں قلعے میں قید رہا
پائی جونہی رِہائی، دی دستک

تُم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟
مَیں نے جب، میرے بھائی، دی دستک

لازمی تھا ، اِسی لیے یہ کِیا
توڑ کر بھی کلائی، دی دستک !

ایک صورت جو دیکھی چلمن میں
دل کو ایسی لبھائی، دی دستک

جانتا تھا ، رسائی مشکل ہے
بھول کر نارسائی ، دی دستک

مَیں نے کل شب یہ خواب میں دیکھا
وہ مرے در پہ آئی ، دی دستک !

اِک تنہائی کمی رہی شاید
اُس نے بس دو تنہائی دی دستک

مَیں نے تقلیدِ شیخ میں اِک دِن
بھول کر پارسائی ، دی دستک

تیرگی کے سیاہ در پہ نسیم
اک کرن جگمگائی ، دی دستک

نسیمِ سحر

غزلیں

وجود اوڑھ کے آیا ردائے کن فیکون
سجی حیات پہ کتنی قبائے کن فیکون

ہوئی ظہور کی خواہش چھپے خزانے کو
یہی خیال بنا ہے بنائے کن فیکون

گلِ ازل کی مہک ذہن پر نہ کھل سکتی
اگر چمن میں نہ چلتی ہوائے کن فیکون

عجب نہیں کہ ہو پورا خلوص وخیر کا خواب
خدا سے مانگتے رہنا دعائے کن فیکون

عروجِ آدم خاکی ہے بزمِ ہستی میں
نمو پزیر ہے جیسے فضائے کن فیکون

شعور وفہم کے ہوتے ہوئے جدال وقتال
کسی طرح بھی نہیں ارتقائے کن فیکون

کلامِ حضرتِ اقبال میں ملا ہم کو
کوئی کمال نہیں ماورائے کن فیکون

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدا کن فیکون

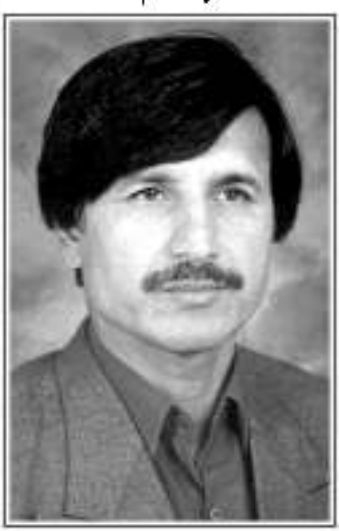

گلزار بخاری

رنجش کی بات فرض ہے کیا پھر کبھی سہی
ہنس کر گلے لگاؤ گلہ پھر کبھی سہی

آغاز کیجیے کسی حرفِ نشاط سے
سازِ سخن پہ تلخ نوا پھر کبھی سہی

بہتر ہے کچھ امید کی صورت بنی رہے
وعدے میں حرج کیا ہے وفا پھر کبھی سہی

اظہارِ اشتیاق مناسب ہے وقت پر
چلیے بیانِ آب و ہوا پھر کبھی سہی

آتے ہی یہ خیال پریشانیاں گئیں
ہے تکیۂ کلام ترا پھر کبھی سہی

اُس جاں بہ لب مریض کا انجام سوچیے
جس کو کہے طبیب دوا پھر کبھی سہی

گلزار ایک بار ہی ملتی ہے زندگی
کہتے ہو کیوں گلی میں سدا پھر کبھی سہی

غزل

میرے قدموں تلے ہے نیا راستہ، میں اکیلا نہیں
آندھیوں سے کہیں تیز تر اے ہَوا، میں اکیلا نہیں

عکس تو خیر ہے شیشۂ ساعتِ بے خبر میں کہیں
میری تنہائی بھی ہے مرا آئنہ، میں اکیلا نہیں

چاند بھی ہے مری صبحِ پُرنور کا منتظر شام سے
اے غنیمِ شبِ ابتدا دیکھنا، میں اکیلا نہیں

یہ زمیں جس کی ہے، اس پہ میرے قدم رُکنے والے نہیں
وہ، مرے ساتھ ہے دُور تک راستہ، میں اکیلا نہیں

میرے اشعار ہی میرے ہم راز ہیں، میرے دم ساز ہیں
میرے اندر ہے کوئی ہنر آشنا، میں اکیلا نہیں

کوئی پہلو میں رہتے ہوئے بھی ہے مجھ سے جدا اِن دنوں
میرا سینہ سمندر ہے، دل ناخدا، میں اکیلا نہیں

خالد علیم

غزل

سر کہاں پوٹلی عناد کی ہے
زندگی ہے کہ جڑ فساد کی ہے

گڑ کدھر خال خال بیلنے ہیں
اب کہاں فصل وہ کماد کی ہے

سانس چڑھتی اترتی رہتی ہے
دل میں سیڑھی تمہاری یاد کی ہے

آسمان کو بڑا تجسس تھا
کیا کہانی زمین زاد کی ہے

بابل و نینوا کے قصے ہیں
گفتگو کیا ثمود و عاد کی ہے

کن سے پہلے خدا اکیلا تھا
یہ کہانی تو ساری بعد کی ہے

گھومتی ہے دماغ کی چرخی
جیسے کوئی پلی خراد کی ہے

ہم نے انسانیت کا خون کیا
شکل یہ کون سی جہاد کی ہے

وہ مہکتا ہے اس کے ہونٹوں پر
آ روز جس گل مراد کی ہے

کچھ تو وہ حد سے خوبصورت تھی
کچھ کمی مجھ میں اعتماد کی ہے

مسعود احمد

غزل [اعجاز کنور راجہ کے نام]

اچھا ہے عجز و ناز مگر اس قدر بھی کیا
دنیا سے بے نیاز مگر اس قدر بھی کیا

یوں بے وفائی کر کہ کسی کو گماں نہ ہو
کر ہم سے احتراز مگر اس قدر بھی کیا

ہم پر بھی منکشف ہو کوئی وارداتِ دل
ہم سے چھپاؤ راز مگر اس قدر بھی کیا

یہ داغ داغ آنکھیں ہیں اور داغ داغ دل
اے میرے شیشہ ساز مگر اس قدر بھی کیا

رونا رلانا ٹھیک نہیں بات بات پر
رکھو دلِ گداز مگر اس قدر بھی کیا

اتنا بھی کیا کہ نکتے پہ سمٹے یہ کائنات
اچھا ہے ارتکاز مگر اس قدر بھی کیا

یکسانیت تو بار ہے عیش و طرب میں بھی
تسکیں ہے سوز و ساز مگر اس قدر بھی کیا

تنہائی ایک زہر ہے اے سعد اجتناب
تو ہے تو بے لحاظ مگر اس قدر بھی کیا

سعد اللہ شاہ

غزلیں

ایسا بھی کیا، کبھی کبھی ملتے رہا کرو
اچھی نہیں یہ بے رُخی ملتے رہا کرو

یہ دُوریاں دلوں میں دراڑیں نہ ڈال دیں
قائم رہے گی دوستی، ملتے رہا کرو

ایسا نہ ہو کہ جب کبھی فرصت ملے تمھیں
مصروف ہوں بہت ہمی، ملتے رہا کرو

ہم سو گئے تو جاگ نہ پائیں گے عمر بھر
کچھ دیر کی ہے زندگی، ملتے رہا کرو

جانِ انیس! رنجِ فراواں کے باوجود
منسوب تم سے ہے خوشی، ملتے رہا کرو

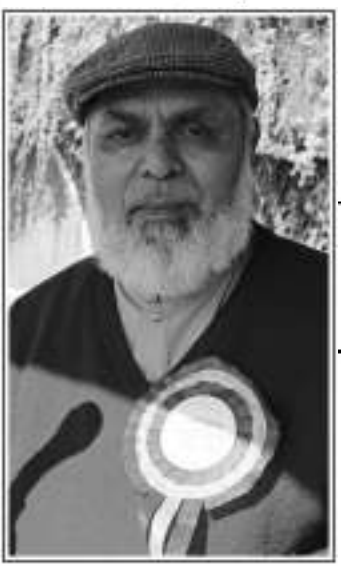

محمد انیس انصاری

اے آنکھوں میں بسنے والو! کب اپنی چھب دکھلاؤ گے
تم کس بستی میں رہتے ہو، تم کس دن ملنے آؤ گے

اک بھولا بسرا ساز سُنے، مدت گزری آواز سُنے
کیا روح کے تار ہلاؤ گے، کیا آج وہ گیت سناؤ گے

ہم چاندنی چاندنی ڈھونڈ چکے، تارے بھی تمھارا پوچھ چکے
کب تک بدلی کے آنچل میں تم اپنا آپ چھپاؤ گے

رنگ روپ وہی مہتابی ہے چہرے پہ وہی شادابی ہے
سورج گہنا جائے گا مگر تم کبھی نہیں گہناؤ گے

تم تتلی ہو تو رنگوں کی بارش کب ہوگی جانِ انیس!
تم پھول ہو تو میرا آنگن کب خوشبو سے مہکاؤ گے

غزل

چاند کو تصویر کر اور چاندنی میں گھر بنا
ظلمتِ شب سے پرے اِک روشنی میں گھر بنا

نسلِ نو کے سر پہ مت رکھ، دھوپ کا تُو سائباں
زندگی میں بن سکے تو زندگی میں گھر بنا

رات کو گھر لوٹنے کا لطف ہے اپنی جگہ
زیست بے شک کاٹ دے آوارگی میں گھر بنا

دشت جیسا پُرسکوں ماحول شہروں میں نہیں
قیس بن کر عالمِ دیوانگی میں گھر بنا

کربلا کی یاد تازہ کر حصارِ جبر میں
ریت پر خیمہ لگا اور تشنگی میں گھر بنا

جا کتابِ زیست پر اپنی کہانی ثبت کر
شعر کی تزئین کر اور شاعری میں گھر بنا

رات کے چہرے پہ لکھ اقبال اِک تازہ غزل
اک دیا دل کا جلا اور تیرگی میں گھر بنا

اقبال سروبہ

غزل

ہر صبح تڑپتی ہوئی اک رات لگے گی
جب تیرے تعاقب میں مکافات لگے گی

کیا ہوگا خدا جانے ترے حسن کی دولت
ہم جیسے طلب گاروں کے جب ہاتھ لگے گی

ایسا ہی رہا گر تو مری آہ و بقا بھی
دنیا کو کبھی کشف و کرامات لگے گی

عینک سے تعصب کی نظر آئے گا الٹا
جیتی ہوئی بازی بھی تجھے مات لگے گی

ایسا ہی رہا گر تو مری آہ و بقا بھی
دنیا کو کبھی کشف و کرامات لگے گی

اس باریوں اجڑے ہیں کہ آئندہ ہمیں تو
لگتا نہیں ایسی کبھی برسات لگے گی

چہرہ ہی بتا دے گا مری جملہ شکایات
تصویر بھی عرضی کے اگر ساتھ لگے گی

لے جائے گی اس عالمِ حیرت میں محبت
جس میں شبِ فرقت بھی ملاقات لگے گی

چاہے ہو ساعت پہ زرہ جیسی بھی راحت
گولی کی طرح دل میں تری بات لگے گی

راحت سرحدی

غزل

لکھے تھے جنتری میں جو وہی تاخیر سے پہنچے
تمھاری آرزو کے دن بڑی تاخیر سے پہنچے

ہمیں دستِ شہی سے کون سا انعام لینا تھا
چلو اچھا ہوا گر تھوڑی سی تاخیر سے پہنچے

سُنا ہے کائناتِ عشق میں کچھ ایسی جگہیں ہیں
جہاں بہتر یہی ہے آدمی تاخیر سے پہنچے

دُکھوں کے راستے کو خود کشادہ کر رہے ہیں ہم
گلہ کیسا جو ایسے میں، خوشی تاخیر سے پہنچے

سجایا عشق نے ہر سمت دسترخوانِ رسوائی
وہ ہے محرومِ نعمت جو کوئی تاخیر سے پہنچے

یقیناً عشق کے در سے نیازِ درد مل جاتی
ندامت ہے ہمیں ہم واقعی تاخیر سے پہنچے

ہمیں دشتِ جنوں اس جُرم پر بے دخل مت کرنا
زیادہ تو نہیں بس دو گھڑی تاخیر سے پہنچے

بلایا جب مقامِ نارسائی نے ہمیں طالب
کبھی ہم دوڑ کر پہنچے، کبھی تاخیر سے پہنچے

طالب انصاری

غزلیں

میں اک حصارِ طلب سے نکل کے دیکھوں گا
مزاج اپنا کسی دن بدل کے دیکھوں گا

یہ کتنا سچ ہے ترا دعویٰ وفاداری
میں چند روز ترے ساتھ چل کے دیکھوں گا

ابھی تو کچھ بھی یہاں میری دسترس میں نہیں
میں بے خودی میں کسی شب سنبھل کے دیکھوں گا

ہر ایک نقش اگر رائیگاں ہی ہونا ہے
پرائی آگ میں چپ چاپ جل کے دیکھوں گا

ابھی تو غم کے تسلسل میں جاں سلگتی ہے
یہ دل کا زہر کسی دن اگل کے دیکھوں گا

نشۂ یہ کیا ہے زمانے کو روشنی دنیا
کبھی چراغ کی صورت میں جل کے دیکھوں گا

شفیق دید کا منظر ابھی اُدھورا ہے
اُسے دوبارا میں آنکھوں کو مَل کے دیکھوں گا

شفیق احمد خان

گھر کی وحشت سے تھے بیزار چلے آئے ہیں
بے طلب جانبِ بازار چلے آئے ہیں

جستجو خام ہے اب چاہے کسی سمت چلیں
چھوڑ کر سایۂ دیوار چلے آئے ہیں

ایک اندوہِ مسلسل میں کہاں تک رہتے
لے کے اک رنجِ گراں بار چلے آئے ہیں

طبعِ سیماب سے نکلے ترے گھر کی جانب
راستے گرچہ تھے دشوار چلے آئے ہیں

کون کہتا تھا کہ یوں رونقِ بازار بنو
اب خفا کیوں ہو خریدار چلے آئے ہیں

کوئی بتلاؤ کہ ان کا تو کوئی مول نہیں
خواب لے کر سرِ بازار چلے آئے ہیں

کل تلک محو تھے اک خواب گزشتہ میں شفیق
ہو کے اک نیند سے بیدار چلے آئے ہیں

غزل

سلوک جو بھی کرے اب وہ اس غلام کے ساتھ
کیا ہے زیر مجھے اس نے اہتمام کے ساتھ

یہی نہیں کہ وہ خنجر بکف نکلتا ہے
کہ اب تو زخم بھی دیتا ہے وہ کلام کے ساتھ

میں آج تک اسی نظارے کے حصار میں ہوں
طلوعِ صبح کی صورت کھلا جو شام کے ساتھ

مجھے پتا ہے اسے لوٹ کر نہیں آنا
میں جی رہا ہوں ابھی تک خیالِ خام کے ساتھ

وہ بے سبب نہیں جاتا کسی کے پاس کبھی
وہ مرے پاس بھی آیا ہے ایک کام کے ساتھ

قدم قدم پہ بپا کرتا ہے قیامت جو
وہ بجلیاں ہی گرائے گا ہر خرام کے ساتھ

ہماری ایک بھی سنتا نہیں دلِ منہ زور
گزارا پھر بھی کیا ایسے بے لگام کے ساتھ

حضور جو بھی کریں آگے آپ کی مرضی
کہ ہم نے عرض گزاری ہے احترام کے ساتھ

میں مانتا ہوں وہ ڈھاتا ہے ہر ستم مجھ پر
مرا خیال بھی رکھتا ہے انتقام کے ساتھ

جلیل اس کے رویے پہ پھر یہ حیرت کیوں
سلوک ایسا ہی کرتا ہے وہ تمام کے ساتھ

احمد جلیل

غزل

اسلام عظمی

کہ ہم فردا میں شامل ہو رہے ہیں
جو حاصل ہے اُسے بھی کھو رہے ہیں

زیاں کا رنج ہے اور یہ خوشی بھی
کہ خود پر منکشف ہو تو رہے ہیں

تماشے میں بہت ہے دیر بھیّا
ابھی کردار سارے سو رہے ہیں

نئی اک پیشکش سے پیشتر وہ
پرانے داغ دھبے دھو رہے ہیں

کھلے گی آنکھ تو منظر کھلے گا
ابھی تو خواب فصلیں بو رہے ہیں

زباں ہر ایک پر شکوہ یہی ہے
پرایا بوجھ بے جا ڈھو رہے ہیں

نہیں ہے ڈھنگ کا عظمی یہاں کچھ
خوشی ایسی ملی ہے رو رہے ہیں

غزل [نذرِ جون ایلیا]

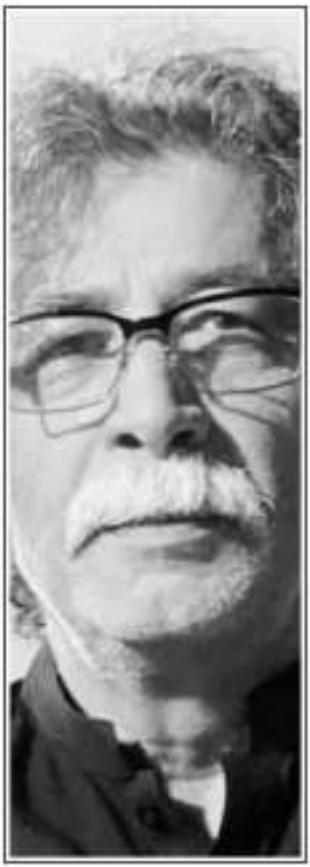

دنیا کی بات مان لی ، دِل کا کہا نہیں کیا
جی کا زیاں تھا کارِ عشق ، اچھا کیا نہیں کیا

آنکھوں سے مِل گئی تو پی، خوں سے کشید کی تو پی
بادہ کشانِ درد نے سستا نشہ نہیں کیا

نشے میں نصف شب گیا دھیان نماز کی طرف
اشکوں سے کر لیا وضو ، سجدہ ادا نہیں کیا

سچ کے سوا نہ کچھ لکھا، سچ کے سوا نہ کچھ کہا
ہم نے کوئی گناہ اور اس کے سوا نہیں کیا

تُو کیا ہے اور کون ہے، رُک جا زمینِ جون ہے
عجزِ سخن کا بھی لحاظ تُو نے ذرا نہیں کیا

سید عارف امام

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے تری آنکھیں، مرے چہرے پہ سجا دیں
کس نے مرے آنسو تری پلکوں پہ جڑے ہیں

غزل

یونہی نہیں بنے ہیں فسانے تمہارے ساتھ
کچھ سلسلے تھے صدیوں پرانے تمہارے ساتھ

مجھ سے بچھڑ کے تم بھی اکیلے ہی رہ گئے
ورنہ کھڑے تھے کتنے زمانے تمہارے ساتھ

روکیں گے ہم بھی کالی ہواؤں کا راستہ
ہم بھی کھڑے ہیں شمع جلانے تمہارے ساتھ

آخر میں سارے ہجر خسارے مجھے ملے
نکلا تھا میں تو عشق کمانے تمہارے ساتھ

خوشبو نگر سے ٹھنڈی ہوائیں بھی چل پڑیں
روٹھی ہوئی بہار منانے تمہارے ساتھ

پٹا پڑی ہوئی تھی دلِ نامراد پر
گائے نہ جا سکے جو ترانے تمہارے ساتھ

اتنی ہی سہہ رہا ہوں میں دل کی ملامتیں
جتنے تراشتا ہوں بہانے تمہارے ساتھ

سالارِ شوق! آپ ارادہ تو کیجئے
آئیں گے کشتیوں کو جلانے تمہارے ساتھ

کتنے دنوں یہ وصل کا موسم ہو دستیاب
کتنا کٹے گا وقت نہ جانے تمہارے ساتھ

افتخار شاہد

غزل

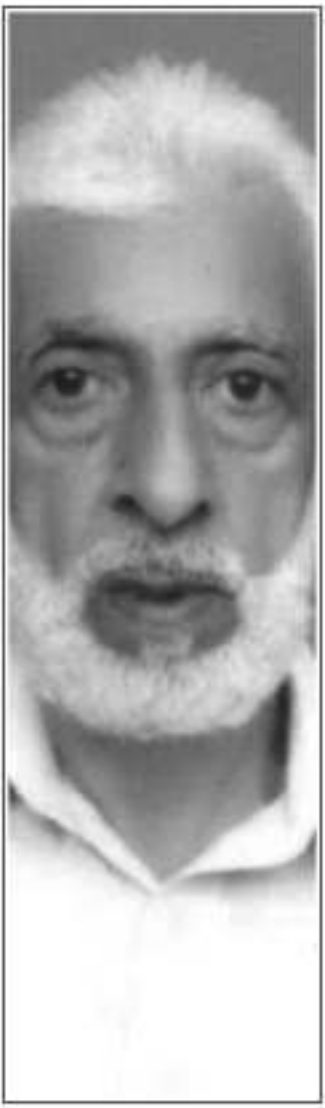

وہ کوئی وعدہ نبھائے یہ تو ممکن ہی نہیں
لوٹ کر وہ پھر سے آئے یہ تو ممکن ہی نہیں

تار چھیڑے پھر سے دنجلی کے یہاں رانجھا کوئی
ہیر پھیر سے چونک جائے یہ تو ممکن ہی نہیں

بیٹیوں کے سر پہ شفقت سے بھرا اِک ہاتھ ہو
پیار کوئی پھر نبھائے یہ تو ممکن ہی نہیں

گھر کو لوٹے پھر سے ابو بن کے بچّوں کی اُمید
پھر سے لوری ماں سنائے یہ تو ممکن ہی نہیں

اپنے حق کے واسطے لڑنے کو جو تیار ہے
فرض اپنا وہ نبھائے یہ تو ممکن ہی نہیں

پیٹ بھر سب کھانا کھائیں اور سوئیں چین سے
خوبصورت خواب آئے یہ تو ممکن ہی نہیں

اس کا میرا ساتھ شاہد جسم و جاں کا ساتھ ہے
درد پیچھا چھوڑ جائے یہ تو ممکن ہی نہیں

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

جہل کی کٹڑی سے ہی بڑھتے ہیں جالے ذہن کے
رَفتہ رَفتہ مِٹتے جاتے ہیں اُجالے ذہن کے

علم رَوشن ، علم اُجلا ، علم ہے نُورِ خُدا
علم کی چابی سے ہی کھلتے ہیں تالے ذہن کے

پھر بھی ذہنوں سے مِٹا پائے نہ یادِ کربلا
ظالموں نے تاج نیزوں پر اُچھالے ذہن کے

میں لکھاری ہوں، جہاں کے درد میں میری متاع
میں نے غم حرفوں کی صورت میں سنبھالے ذہن کے

ایک دِن پاگل بنا دے گا تمھارا پیار بھی
کر رہا ہوں دَرد و غم سارے حوالے ذہن کے

بیچ کر دنیا میں جو زندہ رہا رزقِ سُخن
کھا رہا ہے اصل میں وہ بھی نوالے ذہن کے

خامشی سے پھُٹ نہ جائے سوچ کا آتش فشاں
دوستوں سے بات کر، لاوے بہالے ذہن کے

جگ کی ساری ظلمتیں کافُور کرنے کے لیے
ہم نے سارے چاند سورج ہیں اُچھالے ذہن کے

جن کی سوچیں ہر طرف پھیلا رہی ہیں تیرگی
ہم کو اکثر ہی ملے ہیں لوگ کالے ذہن کے

سو طرح سے باندھتے ہیں ایک مضموں کو عقیل
ہوتے ہیں شاعر انوکھے اور نرالے ذہن کے

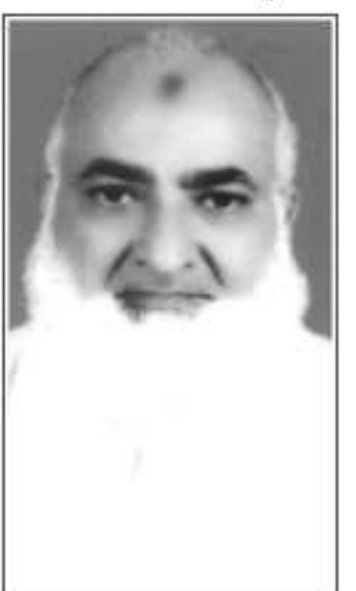

عقیل رحمانی

غزل

راہ دشوار ہے عزیز خیال
لفظ سے بڑھ کے ایک چیز خیال

ایک شاعر کا مسئلہ کب ہے
پھول، پنسل، بٹن، قمیض خیال

منتظر ہو جو شاہزادے کی
شاہ کا کیا کرے کنیز خیال

درد کے ایک سلسلے سے ہیں
تتلیاں، پھول، رنگ نیز خیال

اسے منظوم روز کرتا ہوں
جو نہیں ہے مجھے عزیز خیال

ذہن میں روز جھم جھماتے ہیں
کئی یادیں کئی لذیذ خیال

تجھ سے پرہیز کر لیا دل نے
اور کتنا رکھے مریض خیال

میری سوچوں کو ڈس گیا توقیر
آ گیا تھا کوئی غلیظ خیال

توقیر عباس

غزل

دور کھڑی ہے شہزادی ، شہزادوں سے
واقف ہے وہ ان کے نیک ارادوں سے

آج بھی میں نے بیٹھ کے خالی کمرے میں
دل بہلایا ، بھولی بسری یادوں سے

جانے والوں کی اپنی مجبوری تھی
ورنہ کون بچھڑتا ہے اولادوں سے

اک لشکر ہے پیچھے گھوڑ سواروں کا
مانگ رہا ہے جو امداد پیادوں سے

مجھ کو رفتہ رفتہ کیسے مار گیا
میرا مِلنا جُلنا بے بنیادوں سے

ایک ذرا سی بات پہ لڑنے والوں کو
روز منا لیتے تھے ہم فریادوں سے

دیکھو سامنے میر و مرزا بیٹھے ہیں
آؤ انصر ملتے ہیں اُستادوں سے

انصر حسن

غزل

تمام رات گزر جائے ، گفتگو بھی نہ ہو
اک ایسی ہم سفری ہو کہ جس میں تو بھی نہ ہو

وہ سرسری نہیں بھرپور ہو ، کہا گیا ہے
اور اس پہ یہ کہ ملاقات روبرو بھی نہ ہو

محاذ ، جس میں فریقین ہوں وجود و عدم
غضب کا رن پڑے اور کوئی دو بدو بھی نہ ہو

بڑی شدید محبت ہو ہم میں ، اتنی شدید
مجھے تمھاری ، تمھیں میری آرزو بھی نہ ہو

ہے اس طرح ترا نعم البدل مجھے درکار
جو مختلف بھی نہ ہو، تجھ سا ہو بہو بھی نہ ہو

ذرا سا فاصلہ رکھ، کھل کے سانس لے پاؤں
قریب آ ، مگر اس طرح چار سو بھی نہ ہو

الگ الگ ہیں تو پھر یہ حجاب ، کیا معنی
جدا نہیں ہیں تو بیکار جستجو بھی نہ ہو

ہوس کدہ تری دنیا ، مکیں خصیمِ مبیں
عبث ہے پھر یہ توقع کہ ہاؤ ہُو بھی نہ ہو

رانا غلام محی الدین

غزل

زندگی کیسے لگی دیوار سے
پوچھنا بھی کیا کسی دیوار سے

بس مجھے سر پھوڑنے کا شوق تھا
بات تھی دیوار کی دیوار سے

ٹوٹتے دل کی کہانی بھی کہی
یعنی پھر ٹوٹی ہوئی دیوار سے

آؤ ہم دیوار گریہ کا پتہ
پوچھ لیتے ہیں کسی دیوار سے

جو رکاوٹ تھی ہماری راہ کی
راستہ نکلا اسی دیوار سے

دستکوں سے در تھے ایسے بے نیاز
لگ گئیں آنکھیں مری دیوار سے

اس طرف سورج نکل آیا ہے کیا
آ رہی ہے روشنی دیوار سے

اظہر عباس

غزلیں

مل کر جو مجھ سے شاد ہو ملتی رہا کرو
اچھے دنوں کی یاد ہو ملتی رہا کرو

مانا یہ روز روز کا ملنا نہیں ہے ٹھیک
ملتی دنوں کے بعد ہو ملتی رہا کرو

غم سے بھرے ہوئے مرے دل میں کبھی کبھی
خوشیوں کا انعقاد ہو ملتی رہا کرو

جس پر مرے کلام کا دار و مدار ہے
تم ہی تو میری داد ہو ملتی رہا کرو

فخر عباس

جسم ملتے ہیں تو نادانی ہوا کرتی ہے
وصل کی اپنی پریشانی ہوا کرتی ہے

فہم و ادراک وہاں دیکھتے رہ جاتے ہیں
دل نے اپنی ہی کوئی ٹھانی ہوا کرتی ہے

اشک کے ساتھ جواب خون بھی آجاتا ہے
دل میں بارش کبھی طوفانی ہوا کرتی ہے

اپنے ہی لوگ ہوں گر دل کو دکھانے والے
غم سے بڑھ کر ہمیں حیرانی ہوا کرتی ہے

پرچم وفا کا کس طرح رکھنا ہے سربلند
مل کر یہ اجتہاد ہو، ملتی رہا کرو

تازہ غزل کے شعر بھی تخلیق ہو سکیں
آساں یہ اقتصاد ہو ملتی رہا کرو

خواب میں کیوں نہ اسے حور سمجھ بیٹھیں ہم
اس کی صورت بھی تو نورانی ہوا کرتی ہے

اس کے اس موڈ کو مت پیار سمجھنا یارو!
اچھے موسم میں وہ دیوانی ہوا کرتی ہے

غزل

چاہے جیسا ہے محبت والا
رستہ سیدھا ہے محبت والا

بھول سکتا ہوں تجھے مَیں کیسے
تجھ سے رشتہ ہے محبت والا

میں تو صحرا ہوں مگر رستے میں
وہ جو دریا ہے محبت والا!

نفرتوں والے اکٹھے ہیں سب
اور اکیلا ہے محبت والا

کونج کُرلاتی ہوئی پھرتی ہے
رشتہ ٹوٹا ہے محبت والا

بھرنے والو! یہ رہے گا تازہ
زخم اپنا ہے محبت والا

روشنی ہو گئی آنکھوں میں ظہور
آنسو چمکا ہے محبت والا

ظہور چوہان

غزل

نگاہوں سے ہُوا دل تک سفر آہستہ آہستہ
محبت کا ہُوا پھر یوں اثر آہستہ آہستہ

کہ جیسے زندگی اور موت کے مابین ہے پردہ
جھکا کر یوں اُٹھاتے ہیں نظر آہستہ آہستہ

کِیا ایسے مجھے گھائل تری مخمور آنکھوں نے
ڈبوئے جیسے کشتی کو بھنور آہستہ آہستہ

میں سب کچھ جان کر بھی اُس کی چاہت میں رہا خاموش
کِیا اُس نے مجھے زیر و زبر آہستہ آہستہ

ہوا نذرِ خزاں اُس کی نگاہوں کے تغافل سے
درونِ دل محبت کا شجر آہستہ آہستہ

جتن لاکھوں کیے میں نے مگر اللہ جانے کیوں
اُجڑتا ہی رہا دل کا نگر آہستہ آہستہ

تمھاری طرح سے منہ پھیر کر ہاں زندہ رہنے کا
ہمیں بھی آ ہی جائے گا ہنر آہستہ آہستہ

ہمیں معلوم ہے کہ اُڑتے رہنے سے کوئی دن میں
فضاؤں میں کُھلیں گے بال و پر آہستہ آہستہ

ندیمؔ ناتواں تیری خبر گیری پہ نادم ہے
"مہلی مجھ کو ترے غم کی خبر آہستہ آہستہ"

ریاض ندیم نیازی

غزلیں

اے عشق، رہِ عشق میں خاصی سے زیادہ
کی میں نے عبادت، کسی داسی سے زیادہ

لاحق ہے مجھے ہجر سو مرجھائی ہوئی ہوں
بے رونق و بے رنگ ہوں باسی سے زیادہ

آسودہ کسی یاد کے ریشم میں رہی ہوں
اے رات تری نرم لباسی سے زیادہ

تشنہ ہے بہت موج مگر میری طرف دیکھ
مجھ دشت میں بھٹکی ہوئی پیاسی سے زیادہ

آئے گا مسیحا کے بہت کام شفا میں
آنکھوں کا بیاں نبض شناسی سے زیادہ

اس دردِ جدائی کی ہے اک کاٹ الگ ہی
کاٹے جو دل و جاں کو اداسی سے زیادہ

رخشندہ ابھی آنکھ میں آنسو بھی ہیں باقی
باقی ہے ابھی رات بھی خاصی سے زیادہ

رخشندہ نوید

آنکھ میں کاجل نہ رُخ پہ غازہ ہونا چاہیے
حالتِ بیمار کا اندازہ ہونا چاہیے

گاہے گاہے اس لیے شبنم سے چہرہ تر کیا
پھول جیسا درد آخر تازہ ہونا چاہیے

روزنِ دیوار کی ہر اک کرن کے ساتھ ساتھ
آنکھ میں وسعت کو بے اندازہ ہونا چاہیے

زندگی میں اس قدر ترتیب بے موقع نہیں
کچھ ہواؤں کے لیے شیرازہ ہونا چاہیے

احتیاط اے دل گزشتہ تجربوں سے کام لے
واپسی کا کوئی تو دروازہ ہونا چاہیے

غزل

لے کے تیری ہی ، جستجو نکلا
دل یہ اپنا ہے کو ، بہ کو نکلا

باپ کے جیسے مہرباں سب پر
اس کا بیٹا بھی ہو ، بہو نکلا

جو کہ دریائے سندھ ، لگتا تھا
وہ تو کم آب ، کوئی جو نکلا

خود کو استاد ہم سمجھتے تھے
اور تو بھی بڑا ، گرو نکلا

تجھ سے امید چیت جیسی تھی
اور بھادوں کے جیسا ، تو نکلا

نکلا جو گھر سے جس بہانے بھی
لے کے تیری ہی ، آرزو نکلا

دیکھا جاتا تھا جو ، حقارت سے
شہر بھر کی وہ آبرو نکلا

چاند پر جا کے یہ ، کھلا عاصم
دیکھنے میں ہی خوب ، رو نکلا

عاصم بخاری

غزلیں

اے رہِ عمر ، ساز و رخت بہت
پا سلامت رہیں ، درخت بہت

ہم نے دیکھا نہیں اٹھا کے نظر
دیکھتا رہ گیا تھا بخت بہت

کون بیچارگی کی زد میں تھا
تم نے دیکھے تو ہوں گے تخت بہت

رُت بدلنے پہ کھل اٹھیں گے ہم
یہ خبر ہے زمیں ہے سخت بہت

گفتگو تھی کہ چل رہی تھی لُو
لہجہِ گُل ہوا کرخت بہت

میں اکائی کی کھوج میں طاہر
ہو گیا دیکھ لخت لخت بہت

قیوم طاہر

وہ مجھ میں شعر کی صورت جگہ بناتا ہوا
نئے سرے سے در و بام کو سجاتا ہوا

اب اس گلوب میں گنجائشیں نہیں میری
بچھڑنے والا ہوں اپنا افق بناتا ہوا

کبھی زباں، کبھی آنکھیں نہ ساتھ دیتی تھیں
وہ بات کھولتا جاتا تھا، کچھ چھپاتا ہوا

یہ میرے بیج ، نمو تک پہنچ نہیں پاتے
پلٹ پلٹ گیا بادل یہاں تک آتا ہوا

سپاٹ نثر سی یہ زندگی تھی، پھر بھی کہیں
غزل کے شعر کا ٹانکا کوئی لگاتا ہو

غزلیں

سمجھ میں آئیں رموزِ چمن، جناب! کسے
ملے ہیں خارِ مغیلاں کسے، گلاب کسے

بگڑ گئی ہے سراسر، فضائے گفت وشنید
سوال کوئی کرے اور ملے جواب کسے

جہاں پہ آگ بگولے اٹھیں، جہاں طوفاں
بلا رہا ہے وہی دشتِ پُر سراب کسے

چراغ راہ کو اس سے غرض نہیں کوئی
کہ اس کی روشنی کرتی ہے فیض یاب کسے

محبتوں کو ہمیشہ ہی سرخرو دیکھا
وگرنہ، پار اتارے بھلا چناب کسے

وصال و ہجر کی تفسیر حسبِ فطرت ہے
کسے سکون میسر ہے، اضطراب کسے

سناتے کس کو، محبت کی داستاں شوکت
کسے ہے شوقِ سماعت یہاں پہ تاب کسے

شوکت محمود شوکت

یقین، کس کو وفا کا ہے، اعتبار کسے
تمام عمر میسر رہا ہے پیار کسے

شعورِ ذات میں گم ہیں ازل سے تیرے فقیر
سنائیں، قصۂ دامانِ تار تار کسے

ملی ہے کس کو، حیاتِ دوام، مقتل میں
بہ فیضِ عشق، امر کر گیا ہے دار کسے

ترے فراق سے محفوظ ہم ہوئے، ورنہ
گہر کی مثل ہے داغِ فراقِ یار کسے

نکل چکے ہیں ہمی لوگ بزمِ خوباں سے
پکارتے ہیں نہ جانے یہ بار بار کسے

چمن چمن پہ خزاں کی اجارہ داری ہے
کوئی کہے، کہیں غارت گرِ بہار کسے

وطن کی مٹی ہے شوکت، سو آنکھ میں ڈالوں
چمن سے بڑھ کے لگیں ورنہ خارزار کسے

غزل

غلبۂ غم یہ عزاداری و ہنگامِ فراق
عرصۂ زیست سے مشروط ہے الزامِ فراق

گنبدِ جاں میں ابھی تک ہے اُسی یاد کی گونج
دیدۂ نم میں لرزتی ہے وہی شامِ فراق

بند پلکوں پہ ہے جلتا ہوا ہر خواب کا عکس
ہے محبت کا صلہ تحفہ و انعامِ فراق

غمِ ہجراں کو ہر اک حال میں سہنا ہوگا
کیوں کہ بھیجا ہے ہمیں آپ نے پیغامِ فراق

آپ کے ہجر سے آباد ہے شب کی آغوش
آہٹیں جاگ اٹھیں دل میں سرِ بامِ فراق

اُن کی باتوں میں کسی طور نہ ہرگز آنا
دل کی دیوار پہ چسپاں ہے یہ پیغامِ فراق

خواہشِ وصل کی پاداش میں یہ ہونا تھا
عمر بھر پیتے چلے جانا ہے اب جامِ فراق

خالدہ انور

غزل

کھلی تھی آنکھ کتنی بار بے داری سے پہلے بھی
رہی تھی گفتگو خود سے گرانباری سے پہلے بھی

میں جتنا بھی نبھائے جا رہی ہوں مصلحت ہے یہ
تعلق واجبی سا تھا رواداری سے پہلے بھی

ہم اپنی ذات کے ہی آنجہانی خواب ہیں شاید
بڑی گنجلک کہانی تھی یہ تہہ داری سے پہلے بھی

سنہرے دل کی تاروں سے بندھا جو سرخ فیتہ ہے
تھا مبہم استعارہ یہ صداکاری سے پہلے بھی

محبت کا شجر کیسا بھی ہو سایا نہیں بنتا
فروزاں غم کا منظر ہے نموداری سے پہلے بھی

سعدیہ بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غموں کا زہر کب سے پی رہے ہیں
نہ جانے کس طرح ہم جی رہے ہیں

غزلیں

جب بشر سے بشر جدا نکلے
کیسے پھر ایک سا خدا نکلے

خود ہی میں انتقام لوں سب سے
میرے اندر سے گر خدا نکلے

آؤ جنگل میں کھل کے بات کریں
جو ہے دل میں دبا دبا نکلے

میں اسی خوف میں ہوں ساتھ اس کے
بعد میں وہ جو باوفا نکلے

اور اک نیک آدمی ہے ملا
منتظر ہوں کہ کب بُرا نکلے

کس خموشی سے ظلم سہتا ہوں
مجھ کو پیٹو کوئی صدا نکلے

سب خطاوار کہہ رہے ہیں مجھے
کچھ تو ، میری بھی اب خطا نکلے

غم نے گہنا دیئے کئی سورج
گھر سے روشن بجھا بجھا نکلے

اعجاز روشن

کہیں زمین کہیں آسمان ہو نہ سکا
منافقین کا میں ہم زبان ہو نہ سکا

خوشی تو ہے کہ میں پہلو میں اُن کا آ پہنچا
ملال ہے کہ مرا امتحان ہو نہ سکا

میں چاہتا تھا کہ جی لوں گا اجنبی بن کر
مگر یہ گھر تو کبھی بھی مکان ہو نہ سکا

تھپیڑے سہہ کے وہ دنیا کے ہو گیا پتھر
میں آئنہ ہی رہا ہوں چٹان ہو نہ سکا

زباں بدل گئی آنکھوں کی اِس زمانے میں
اور اشک غم کا کہیں ترجمان ہو نہ سکا

نکل تو آیا گماں سے یقیں کے رستے پر
مگر یقین کا اپنے گیان ہو نہ سکا

شعور چاٹ گیا ذوق حسن کو روشن
کہ آئنے میں کسی کا گمان ہو نہ سکا

غزلیں

پلکوں کو چپ کرا کے لبوں کو بھی سی لیا
تیری نظر کا جب سے وہ اک جام پی لیا

وارفتگی تھی اتنی کہ خود سے گزر گئے
ورنہ تمھارا نام نہ لب سے کبھی لیا

اپنا تو اختیار محبت میں چھن گیا
اس نے کہا کہ مر کے جیو، مر کے جی لیا

گرچہ ہزار دکھ سے عبارت تھی زندگی
ہائے ہمارے دل نے محبت کو ہی لیا

بے ساختہ نگاہ گلی تک بکھر گئی
دل نے تمھارے نام کا بوسہ ابھی لیا

اویس الحسن

دشمن ہے جان و دل کا مگر بے بسی سے ہم
کرنے لگے ہیں دل سے محبت اسی سے ہم

اس شہرِ اقتدار سے اپنی نہ نبھ سکی
صدیاں گزار کر بھی رہے اجنبی سے ہم

انگلی تھما کے ہم کو اجل تک وہ لے گئی
صدمے اُٹھا چکے ہیں عجب زندگی سے ہم

تصویر آئنے نے اتاری تھی کیا بری
منہ لے کے رہ گئے اسی شرمندگی سے ہم

تہذیبِ غم سے دل میں اُجالا کیا اویس
ورنہ تو کھو گئے تھے تری بے رُخی سے ہم

غزل

آغوشِ آب ہوا ہو ، سمویا ہوا ہو چاند
ساکت ہو جھیل، پانی میں سویا ہوا ہو چاند

پیکر سے اس کے چھن کے نکلتی تھی روشنی
بادل کو جیسے اوڑھ کے سویا ہوا ہو چاند

شاید مجھے کسی نے پکارا تھا شب ڈھلے
ایسا لگا تھا جیسے کہ گویا ہوا ہو چاند

شاخوں سے قطرہ قطرہ ٹپکتی ہے چاندنی
جیسے کسی کے ہجر میں رویا ہوا ہو چاند

گویا تنی ہے چادرِ شب اسطرح شہاب
ٹانکے ہوئے ستارے ، پرویا ہوا ہو چاند

شہاب الدین شہاب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیوں سرِ کہسار آئے
قد بڑھانے اگر آئے ہیں تو بے کار آئے

غزل

نیند میں ماہتاب سا کچھ ہے
خواب میں اور خواب سا کچھ ہے

اس کی موجودگی ہے کمرے میں
آئنے میں گلاب سا کچھ ہے

چکھ کے دیکھو یقیں نہ آئے تو
شہد میں بھی شراب سا کچھ ہے

یاد کرتا نہ بھول پاتا ہوں
اک مسلسل عذاب سا کچھ ہے

روز تازہ سبق سکھاتی ہے
زندگی میں کتاب سا کچھ ہے

ان اندھیروں میں جھانک کر دیکھو
افتخار آفتاب سا کچھ ہے

افتخار شوکت

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شکستگی میں بھی ہم اس کے پاؤں پڑ نہ سکے
کھڑے رہے کسی گرتے ہوئے مکاں کی طرح

غزل

ثنائے ذات کا چسکا لگا دیا مجھ کو
یہ کس نے اپنا پرایا بھلا دیا مجھ کو

اُمنگ جب کبھی جاگی زیارتِ حق کی
جمالِ یار کا جلوہ دکھا دیا مجھ کو

سمو کے اپنی عطا کی تجلیاتِ مبیں
غبارِ راہ سے موتی بنا دیا مجھ کو

بنا کے گوہرِ مقصود، میری آنکھوں سے
کرم نے موج میں آ کر بہا دیا مجھ کو

کبھی شہادتِ منصورؒ کی دکھائی جھلک
کبھی فسانۂ سرمدؒ سنا دیا مجھ کو

زہے نصیب کہ پیرِ مغاں نے آخرِ شب
نگاہِ شوق بنا کر اُڑا دیا مجھ کو

فنا بقا تو کہیں رہ گئے بہت پیچھے
یہ کس مقام پہ لا کے بٹھا دیا مجھ کو

یہ جبر ہے کہ اِسے اختیار کہتے ہیں
نصیب لکھ کے ڈگر پر چلا دیا مجھ کو

رضائے یار کے آگے ہے خم سرِ تسلیم
کبھی نظر کبھی جلوہ بنا دیا مجھ کو

عجب نشہ ہے کہ ساقی نے جامِ کثرت میں
گھلا کے بادۂ وحدت پلا دیا مجھ کو

اُسی کی ذات ہے فیضانؔ نورِ ارض و سما
کہ جس نے پیکرِ خاکی بنا دیا مجھ کو

فیض رسول فیضان

غزل

ان لبوں پر بات آ کر زندگی ہو جائے گی
جس طرف وہ دیکھ لیں گے روشنی ہو جائے گی

زندگانی کا چلن سب کے لیے ہے ایک سا
آشنا ہو جاؤ گے یہ اجنبی ہو جائے گی

عمر کے سب سلسلے بس اک گھڑی ہو جائیں گے
اک تمنا پھیل کر جب زندگی ہو جائے گی

میں اسے مل جاؤں گا بے جستجو اور بے طلب
شہر میں اک روز وہ بھی اجنبی ہو جائے گی

اس کی باتوں کے اثر سے لفظ بھی باہر نہیں
''چاند'' وہ کہہ دے اگر تو چاندنی ہو جائے گی

ہر کسی پر ڈالتی ہیں صحبتیں اپنا اثر
رفتہ رفتہ دوستی ہی دل لگی ہو جائے گی

جیسے بھی ہو، جو بھی ہو، اُس در کو تم مت چھوڑنا
ہوتے ہوتے ایک دن آمادگی ہو جائے گی

عمر کی قدغن نہیں پیارے بشیر احمد حبیب
چاند چہرہ دیکھ لیں گے شاعری ہو جائے گی

بشیر احمد حبیب

غزل

عجلتِ ہجر کو تاخیر پڑی رہتی ہے
میرے پیچھے مری تقدیر پڑی رہتی ہے

اس کے پہلو میں گزاری ہے یونہی عمر تمام
جیسے اک پرس میں تصویر پڑی رہتی ہے

میں میانوالی کا بیٹا ہوں مگر شاعر ہوں
پھول اٹھا لیتا ہوں شمشیر پڑی رہتی ہے

اتنا دلکش ہے وہ منظر میں مناتا ہی نہیں
مہ جبیں روٹھ کے دلگیر پڑی رہتی ہے

حلقہء چشم پہ پردہ سا پڑا رہتا ہے
دل کے دروازے پہ زنجیر پڑی رہتی ہے

اک نظر زعم کی تاریخ پہ ڈالو خالد
قتل ہو جاؤ تو جاگیر پڑی رہتی ہے

مجھ کو پیاری ہے سو عزت کی طرف جاتا ہوں
ورنہ ہر موڑ پہ تشہیر پڑی رہتی ہے

خالد ندیم شانی

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

پستی تو اپنا نام تھا گرنا تو اپنا کام تھا
اَے اَوج! آخر گر پڑے تیرے منارے کس طرح

غزل

رُت اندھیری ، سفر ضروری ہے
تیری روشن نظر ضروری ہے

پھر شرائط بھی میری اپنی ہوں
سانس لینا اگر ضروری ہے!!

یہ پرندے کہیں نہ کھو جائیں
ان کی خاطر شجر ضروری ہے

اپنی اوقات جانچنے کے لئے
زندگی میں بھنور ضروری ہے

آخری اک چراغ باقی ہے
جو سرِ رہ گذر ضروری ہے

تجھ کو دیکھیں تو پھر سویرا ہو
جانِ جاں یہ سحر ضروری ہے

زندگی کاٹنا ہُنر ٹھہرا
آج کل یہ ہُنر ضروری ہے

رات اندھی سروں پہ ہے بابرؔ
گھر بچاؤ کہ گھر ضروری ہے

احمد سجاد بابر

غزل

میں ایسے چُپ جو کھڑا ہوا ہوں مرے عزیزو
خفا ہوں خود سے، لڑا ہوا ہوں مرے عزیزو

فلک پہ اُڑنے کی آرزو کا یہی صلہ ہے
زمیں پہ مُردہ پڑا ہوا ہوں مرے عزیزو

اِسی لیے تو مرے سخن میں یہ تیکھا پن ہے
میں حاسدوں میں بڑا ہوا ہوں مرے عزیزو

سسکتے لوگوں، بلکتی روحوں کو دیکھتا ہوں
میں پھر بھی بے حس کھڑا ہوا ہوں مرے عزیزو

مجھے بتاتے ہو موسموں کا بدلنا کیا ہے
بہار رُت میں جھڑا ہوا ہوں مرے عزیزو

کہانی کب کی مَیں پوری کر کے سنا بھی دیتا
کسی جگہ پر اڑا ہوا ہوں مرے عزیزو

میں کون ہوں کس طرح کا ہوں یہ انہی سے پوچھو
کہ جن دلوں میں گڑا ہوا ہوں مرے عزیزو

میں اپنے اشکوں کے پانیوں میں ہی گھل رہا ہوں
میں جیسے گُل سے گھڑا ہوا ہوں مرے عزیزو

یاسر رضا آصف

غزل

نہیں ہے رنج تمہاری نظر کے ہوتے ہوئے
گزر رہے ہیں سلامت، بھنور کے ہوتے ہوئے

یہ گام گام اذیت ہے کون سمجھے گا
کرائے کا ہے مکاں اپنے گھر کے ہوتے ہوئے

کسی فقیر کی خوشیوں پہ وقف کر ڈالیں
جنہیں سکون نہیں مال و زر کے ہوتے ہوئے

کسی عجیب مصیبت کا استعارہ ہے
کہاں گئے ہیں پرندے شجر کے ہوتے ہوئے

مری پکار پہ لبیک کی صدا گم ہے
بھٹک نہ جاؤں سخی، تیرے در کے ہوتے ہوئے

یہ کوئی عام سعادت نہیں ہے مستحسن
مجھے قبول کیا بیشتر کے ہوتے ہوئے

مستحسن جامی

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

مری بات کہتے رہنا، یہ قلم اُٹھائے رکھنا
یہ علَم فرو نہ کرنا، یہ فلک سجائے رکھنا

غزل

زباں ہے میری طرف اور دل زماں کی طرف
بتاؤ میری طرف ہو کہ تم جہاں کی طرف

کوئی گماں کی طرف ہے کوئی بتاں کی طرف
میں اپنی آنکھیں اٹھاؤں گا آسماں کی طرف

ترے قدم سے قدم ہم ملانے آئیں گے
چلیں گے قافلے اب سب ترے مکاں کی طرف

ترے خلاف ستاروں نے چال چل دی ہے
نظر اٹھا کے ذرا دیکھ کہکشاں کی طرف

کسے مجال کہ وہ ساتھ دے محبت کا
چلے گا کون سوئے دار عاشقاں کی طرف

بہا کے لے گیا سیلاب جب درختوں کو
پرندے کس لیے جائیں گے آشیاں کی طرف

جلی تھی اک کلی کل تک تمہاری نفرت سے
یہ آگ پھیلتی جاتی ہے گلستاں کی طرف

نگل لیا ہے ہمیں موت کے درندے نے
اٹھی ہیں انگلیاں جبرانؔ پاسباں کی طرف

وسیم جبران

غزل

کوزہ گر نے خاک سے کوزہ بنایا کس لئے
اور اِس کوزے میں پھر ارماں جگایا کس لئے

کس لئے بادل کو بھیجا بحر کو جل تھل کرے
تپتے ریگستان میں طوفاں اُٹھایا کس لئے

درد کے رشتے میں جوڑا پہلے دو افراد کو
ایک دل سے دوسرا اِک دل ملایا کس لئے

گلستاں میں کیوں خزاں کو بھیجنا مقصود تھا
اِک مہکتا گُل بیاباں میں کھلایا کس لئے

کیوں دو آنکھیں دے کے بے بس کر دیا انسان کو
بے بسی میں خواب آنکھوں کو دکھایا کس لئے

جب ہمیں معلوم تھا اپنا مقدر ہجر ہے
دل میں پھر اِک یاد نے بھانبڑ مچایا کس لئے

گر اُسے پانا ہماری دسترس میں ہی نہ تھا
دل زمیں پہ عشق کا پودا اُگایا کس لئے

یہ بتا! بھیجا تھا اتنی دور کس پاداش میں
بھیج کر خود ہی ہمیں واپس بلایا کس لئے

شبہ طراز

غزلیں

سسکیاں جب مجھے تڑپاتی ہیں سناٹوں کی
سرحدیں شور سے ملواتی ہیں سناٹوں کی

جب بھی آواز لگاتا ہوں کہ میرا کوئی ہے؟
وحشتیں گونجنے لگ جاتی ہیں سناٹوں کی

میری گم گشتہ صدائیں یہاں مل جاتی ہیں
یہ جو پگڈنڈیاں بل کھاتی ہیں سناٹوں کی

اوب جاتا ہوں میں جب کھردری آوازوں سے
مخملیں بانہیں بہت بھاتی ہیں سناٹوں کی

میری تنہائیاں اشعار میں گونج اٹھتی ہیں
محنتیں یوں بھی ثمر لاتی ہیں سناٹوں کی

اکرم جاذب

لاکھ مشکل ہو پکارا بھی نہیں جا سکتا
قرض اپنوں کا اتارا بھی نہیں جا سکتا

رات جنگل میں گزاری بھی نہیں جا سکتی
اور ہمراہ نظارا بھی نہیں جا سکتا

خیر بھی فطرتِ انساں کا ہے جزوِ لازم
نفسِ امارہ کو مارا بھی نہیں جا سکتا

جان سے پیارے رلائے بھی نہیں جا سکتے
موت کا دیو پچھاڑا بھی نہیں جا سکتا

بیٹھا جاتا بھی نہیں ذہن میں جب کھلبلی ہو
اور کوئی کام سنوارا بھی نہیں جا سکتا

نہ سہی شور میں آواز نمایاں نہ سہی
وقت خاموش گزارا بھی نہیں جا سکتا

ریفری جیتنے مشکل ہی سے دے گا جاذب
مگر آسانی سے ہارا بھی نہیں جا سکتا

غزل

کوشش سے میں مدار سے باہر نکل گیا
آخر ترے دیار سے باہر نکل گیا

پہلے مشقتوں سے بنا خود ہی اک حصار
پھر خود ہی اس حصار سے باہر نکل گیا

انجان منظروں کے تجسس نے آ لیا
پنچھی پھر اپنی ڈار سے باہر نکل گیا

اس نے مجھے کہیں کا بھی رہنے نہیں دیا
جو لفظ اختیار سے باہر نکل گیا

پہرے مری انا کے بہت سخت تھے مگر
آنسو بڑے وقار سے باہر نکل گیا

میں چاہتا نہیں تھا لگے جنگلوں میں آگ
شعلہ مرے چنار سے باہر نکل گیا

میرے سوا تھے اور بھی نغمات ساز میں
بس ایک میں ہی تار سے باہر نکل گیا

مجھ کو بھی مل ہی جاتی نگاہ کرم کی بھیک
میں آپ ہی قطار سے باہر نکل گیا

میں، قافلہ، غبار، سبھی ساتھ ساتھ تھے
پھر قافلہ غبار سے باہر نکل گیا

دنیا میں وہ رہے نہ رہے اس سے کیا غرض
جو نام ذکرِ یار سے باہر نکل گیا

میں بھی تو تیرا چاہنے والا تھا میرے دوست
کیسے ترے شمار سے باہر نکل گیا

لگتا تھا کہ ازل سے ابد تک ہے خارزار
لیکن میں خارزار سے باہر نکل گیا

دنیا کی رونقوں میں ذرا بھی کمی نہیں
کل رات میں مزار سے باہر نکل گیا

اچھا ہوا کہ آج علمدار مر گیا
دنیا کے کاروبار سے باہر نکل گیا

عملدار حسین

غزل

شمع جب یاد کی جل جاتی ہے
رات پھر صبح میں ڈھل جاتی ہے

عشق کی آگ بجھانا بے سود
بجھتے بجھتے بھی یہ جل جاتی ہے

میں تھکن اوڑھ کے جب بھی سویا
نیند گلیوں میں نکل جاتی ہے

خواب آنکھوں میں مچلتے رہ جائیں
نیند پلکوں سے پھسل جاتی ہے

یاد سے یہ رہے آباد اجمل
دل سے ویرانی نکل جاتی ہے

اجمل اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تن اپنی گرد میں پنہاں، دل اپنی موج میں گم
شکستہ جاں نہیں خالد شکستہ پائی میں

غزل

مشکل ہے جینا، ہے نہیں آساں ترے بغیر
رہنے لگی ہوں، کتنی پریشاں ترے بغیر

میں کو بہ کو تلاش کروں، در بہ در پھروں
گلیاں یہ راستے، سبھی سنساں ترے بغیر

سجنا سنورنا اور یہ درپن کا سامنا
باقی نہیں ہیں کچھ بھی تو ارماں ترے بغیر

دنیا کی محفلیں تو ہیں اپنے عروج پر
ہوتا نہیں ہے دل مرا شاداں ترے بغیر

تو ساتھ تھا تو تیز ہواؤں کا ڈر نہ تھا
ہلکی ہوا کا جھونکا بھی طوفاں ترے بغیر

کیسے لگاؤں دل یہاں، کیسے میں خوش رہوں
"دنیا ہے ایک دشت بیاباں ترے بغیر"

افروز دل میں کیوں مرے، انجانہ خوف ہے
کیسے کروں میں گھر میں چراغاں ترے بغیر

افروز رضوی

غزلیں

بادل سیاہ رات کا افسانہ لے اُڑا
یعنی شبِ وصال کا نذرانہ لے اُڑا

ہم طائرانِ رزق کی پرواز یوں ہوئی
گہہ آب کی کشش تھی، کبھی دانہ لے اُڑا

ذودِ چراغ درد لیے دوش پر چلا
محفل سے رازِ شب پر پروانہ لے اُڑا

ذکرِ علیؑ عبادہ کو بہلول پا گیا
فرزانگی کی بات تھی دیوانہ لے اُڑا

دو چار شیشے گاہ مرے ہاتھ کیا لگے
تُہمت لگی یہ مجھ پہ کہ میخانہ لے اُڑا

زُلفیں سنوارنے کے عوض دیکھیے حضور
اِک مہ لقا کا بوسہ لبِ شانہ لے اُڑا

طاہر برائے وعظ کھڑا میکدے میں شیخ
اِک من چلے کے ہاتھ سے پیمانہ لے اُڑا

حرف و نقطہ مچان کر لوں گا
میں قلم کو کمان کر لوں گا

اِن ہواؤں سے کیا ڈراتے ہو؟
اِن کے سر پر اُڑان کر لوں گا

نسلِ آدم کے قاتلوں سے قِصاص
سینہ اپنا میں تان کر لوں گا

اب خداؤں سے معرکے ہوں گے
اب میں خامے کو سان کر لوں گا

میں مراثیؑ و منقبت کہہ کر
حرف و لہجہ کی شان کر لوں گا

قبرِ طاہر پہ اک دیا رکھ کر
روشنی کو نشان کر لوں گا

طاہر یٰسین طاہر

غزل

محمد اشرف کمال

میرے حصے میں جو قسمت نے اجالا لکھا
روشنی آدھی کبھی چاند ادھورا لکھا

میں نے ترتیب سے لفظوں کو جو لکھنا سیکھا
تیری تعریف ترا حرفِ قصیدہ لکھا

جب کھلا بابِ دعا وقتِ مناجات کبھی
میں نے ہونٹوں پہ ترا نام زیادہ لکھا

اک تری ذات کو ہی پیشِ نظر رکھا ہے
جس جگہ میں نے کبھی اپنا حوالہ لکھا

تیرے چہرے سے ہے کھلتے ہوئے رنگوں کا ثبات
موسمِ گل کو ترے گھر کا دریچہ لکھا

آخری باب جو بیٹھا ہوں میں لکھنے کے لیے
زندگی بھر کی مشقت کو تماشا لکھا

میرے الفاظ میں وہ پیاس کی شدت تھی کمال
میں نے صحرا کو بھی بہتا ہوا دریا لکھا

غزل

بہرِ درماں جو کوئی درد کا پیکر نکلے
شاخِ احساس پہ تنویر سجا کر نکلے

اور پھر بارشِ انوار سے بھر دے دامن
تھامے بادل کی کلائی کوئی رہبر نکلے

وہ جو گردابِ بلا ٹھیک گئے جھیل گئے
بحرِ ہستی کے تلاطم میں شناور نکلے

جن کے سینے میں دھڑکتا نہیں ریزہ کوئی
دوست ایسے ہی مری راہ کے پتھر نکلے

وہ کہ جو قوتِ بازو پہ بہت نازاں ہے
آج آ جائے مقابل مرے، باہر نکلے

بدگمانی نے کئی چہرے بجھا رکھے تھے
آزمائے تو رضا سرو و صنوبر نکلے

رضا اللہ حیدر

غزل

ایک بس دل تھا وارنے کے لیے
نظر اسکی اتارنے کے لیے

میری شامیں اجاڑ دیں اس نے
اپنی صبحیں نکھارنے کے لیے

جانے کیا کیا جتن کیے اس نے
چاند چھت پر اتارنے کے لیے

اس نے ہر داؤ آزما ڈالا
میں تو کھیلا تھا ہارنے کے لیے

نام لینا نہیں گوارا کیا
اس نے مجھ کو پکارنے کے لیے

میں ستارے شمار کرتا رہا
بن تیرے شب گزارنے کے لیے

اب نہ ہمت نہ حوصلہ اشفاق
کوئی صدمہ سہارنے کے لیے

محمد اشفاق بیگ

غزل

ہماری رُوح پہ جس غم کا راج ہے، جاناں !
تمہاری روح ہی اس کا علاج ہے، جاناں !

یہ رُوٹھ جاتی ہے بستر کے پاس جاتے ہی
یہ نیند تم سے بھی نازک مزاج ہے جاناں !

محبتوں کو چھپا کر نبھانا پڑتا ہے
سنبھل کے چل، بڑا ظالم سماج ہے، جاناں !

بچھڑتے وقت جو تُو میرے در پہ چھوڑ گیا
وہ نقشِ پا ہی مرے سر کا تاج ہے جاناں !

ذخیرہ اتنا عطا کر ، کبھی نہ بھوکا رہوں
کہ تیری یاد ہی میرا اناج ہے جاناں !

مہکتے رہتے ہیں ہر سُو سمن کی خوشبو سے
ہمارا اب تو یہی کام کاج ہے جاناں !

تجھے چھُوا تو بچے گا نہیں ترا نعمان
یہ شہرِ عشق کا پہلا رواج ہے جاناں!

نعمان محمود

غزلیں

یہ کبھی نا سنا کوٹھیاں جل گئیں
سنتے آئے سدا جھگیاں جل گئیں

بن گئیں اب کے آتش فشاں بارشیں
ایسی برسیں کہ سب بستیاں جل گئیں

بے خیالی میں اس کا بدن چھو لیا
ہاتھ کی میرے سب انگلیاں جل گئیں

کوئی آیا نہ لینے انہیں شہ سوار
آس کی آگ میں لڑکیاں جل گئیں

کن خیالوں میں تھیں لڑکیاں بے خبر
یاد آیا کئی روٹیاں جل گئیں

واپسی کا نہیں کوئی امکان اب
ساحلوں پر سبھی کشتیاں جل گئیں

کیسے پھولیں پھلیں گے زمانے میں وہ
جن درختوں کی سب ٹہنیاں جل گئیں

کون سے غم ہیں جو کھا گئے حسن کو
کیا ہوا چہروں کی سرخیاں جل گئیں

واہ رے دھرتی پیاسی یہ قسمت تری
جب برسنے کو تھیں بدلیاں جل گئیں

وہ چمن کیا جلا کچھ نہ افضل بچا
پھول، غنچے سبھی تتلیاں جل گئیں

افضل ہزاروی

نہ انجام سوچا نہ رسوائی دیکھی
فقط عشق کی ہم نے رعنائی دیکھی

رفو گر بھی چکرا کے گرنے لگے سب
کہ زخموں کی میرے جو گہرائی دیکھی

بھلا اِس سے بڑھ کر بھی ایذا کوئی ہے؟
کہ محفل میں رہ کر بھی تنہائی دیکھی

چمک ماند پڑنے لگی اُن کی فوراً
ستاروں نے تیری جو زیبائی دیکھی

سبھی نے اجاگر کیے عیب تیرے
نہ افضل کسی نے بھی اچھائی دیکھی

غزل

کوکی گل

گھما رہا تھا ، پھرا رہا تھا
مجھے بھی پاگل بنا رہا تھا

عجب دوانہ سا شخص تھا وہ
زمیں پہ کشتی چلا رہا تھا

ہنسی وہ میری اڑا رہا تھا
خود اپنی ہستی جلا رہا تھا

بچھڑ کے جاتے سمے میں بھی وہ
نجانے کیوں مسکرا رہا تھا

تماشہ گر وہ کمال کا تھا
ہوا میں شکلیں بنا رہا تھا

غموں کو اپنے بھلا کے بیٹھا
وہ پتلیوں کو نچا رہا تھا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تیری آنکھیں ہیں کہ ٹھہرے ہوئے پل اے خالد
وقت کیونکر ترے پہلو سے اُٹھا دے مجھ کو

غزل

امجد بابر

بے یقینی میں فیصلہ کیسا
اُس محبت سے رابطہ کیسا

کوہِ افسوس پر کھڑے ہیں ہم
نارسائی کا سلسلہ کیسا

دُشمنوں کو گلے لگاتا ہوں
مجھ کو درپیش مرحلہ کیسا

زہر پانی میں حل نہیں ہو گا
حل طلب ہے یہ مسئلہ کیسا

جل پری عشق کی مخالف تھی
پھر سمندر میں حادثہ کیسا

میں نے کانٹوں کا تاج پہنا تھا
یاد آیا ہے واقعہ کیسا

قُربتیں لازوال ہیں امجد
اپنے لوگوں سے فاصلہ کیسا

غزل

بھلا ہو جتنا بھی چاہے بھلا نہیں ہوتا
بُرا بھی حد میں اگر ہو بُرا نہیں ہوتا

کہاں سے لاتی ہے دنیا عجیب مفروضے
وفا شناس کبھی بے وفا نہیں ہوتا

جہاں کی اور بھی صورت گھناؤنی ہوتی
اگر یہ وعدۂ روزِ جزا نہیں ہوتا

جو حیرتوں کو بھی حیرت میں ڈال دے پھر سے
یہاں اب ایسا کوئی سانحہ نہیں ہوتا

ہم اعتبار کریں کس پہ، کس سے بچ کے رہیں
کسی کے چہرے پہ کوئی لکھا نہیں ہوتا

خرد کے ساتھ رہے دل تو معجزہ سمجھو
ستم تو یہ ہے کہ اب معجزہ نہیں ہوتا

ہم آپ جیسے بڑا اہتمام کرتے ہیں
زمیں ہلانے کے حق میں خدا نہیں ہوتا

ردا حاصل خلوص

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

غموں کا زہر کب سے پی رہے ہیں
نہ جانے کس طرح ہم جی رہے ہیں

غزل

فوراً سپاہِ شوم کی للکار بند ہو
جونہی الف جلال سے میرا سمند ہو

اپنے ہی دل پہ جب مرا قابو نہیں رہا
کیسے کسی جہان پہ میری کمند ہو

تیرے نواح میں کئی کچے مکان ہیں
اتنا نہ سطحِ آب سے دریا بلند ہو

انسانیت وجود کے جوہر کا نام ہے
سو آنکھ نم نہ ہو بھی تو دل درد مند ہو

تنگ آ گیا ہوں دیکھ کے ہموار زندگی
جی چاہتا ہے اب کہیں پست و بلند ہو

کرتا نہیں کسی کے سہارے پہ انحصار
جس شخص کا مزاج حقیقت پسند ہو

چلتا ہوں میں بھی ساتھ معافی کے واسطے
ممکن ہے میری ذات سے پہنچا گزند ہو

تب تک کسی کے عشق کا دعویٰ دروغ ہے
جب تک جگر نہ سوختگی سے سپند ہو

میرا نشان کون و مکاں ڈھونڈتے پھریں
ایسی حدودِ جسم سے باہر زقند ہو

ازور شیرازی

غزل

ہماری خاک سے پھوٹی ہوئی ہے
زمیں جو چار سو پھیلی ہوئی ہے

صدا کے سرمئی آنچل پہ آہٹ
ذرا سی دیر کو سوئی ہوئی ہے

کوئی بولے گا جھک کر آسماں سے
چراگاہوں میں خاموشی ہوئی ہے

دعا کی شکل میں بوڑھی کہاوت
سلونی شام میں پھیلی ہوئی ہے

کئی کردار تھک کر سو گئے ہیں
کہانی رات کی جاگی ہوئی ہے

فلک پر کھٹکھٹایا ہے کوئی در
تو پھر جا کر دعا پوری ہوئی ہے

مرے پہلو سے اٹھ کر شاہ زادی
حریمِ ذات میں سوئی ہوئی ہے

تمھاری زلف کی گہری گھٹا اب
ہوا کے دوش پر بھٹکی ہوئی ہے

سحر کے نغمگیں آنگن میں جیسے
ہماری رات کی چوری ہوئی ہے

میرے دل میں محبت خاک زادی
تمھارے ہاتھ کی بوئی ہوئی ہے

ہمارے دل سی نکلی شام جا کر
پہاڑوں پر کہیں چھائی ہوئی ہے

زاہد خان

غزل

جاری ہے قتلِ عام سیاست کے نام پر
مرنے لگے ہیں لوگ محبت کے نام پر

تن پر ہے جن کے پیار لبادہ سجا ہوا
وہ لوٹنے لگے ہیں شرافت کے نام پر

کچھ زرپرست لوگ سرعام اب یہاں
کرتے ہیں کالا دھندہ تجارت کے نام پر

فاقہ زدہ کو آج مرے شہر کے امیر
کرتے ہیں زہر پیش سخاوت کے نام پر

جو لوگ دوسروں کے لیے لڑ رہے ہیں آج
دھبہ ہیں ایسے لوگ شجاعت کے نام پر

کچھ لوگ بے عقیدہ مرے دیس کے حکیم
قرآن بیچتے ہیں امامت کے نام پر

حکیم خان حکیم

غزل

یہ لوگ کسی سے بھی رعایت نہیں کرتے
بے لوث خدا سے بھی محبت نہیں کرتے

کیوں ہم سے ہراساں ہو، تسلّط ہے تمھارا
کردار مصنف سے بغاوت نہیں کرتے

جو دیکھنا چاہیں ہمیں دنیا کی نظر سے
پھر ہم بھی عطا ان کو بصارت نہیں کرتے

نادان نکل آئے ہیں تاریکیٔ شب سے
اب چاند ستاروں کی عبادت نہیں کرتے

لے آئیں کوئی ڈھونڈ کے انسان کا ہمسر
ہم اہلِ جنوں ایسی حماقت نہیں کرتے

مَیں ہاں میں مِلاتا نہیں ہاں ان کی خیالی
احباب بھی اب میری وکالت نہیں کرتے

زبیر خیالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاند کیا جل بجھے ستارے بھی
ہو گئے خوں یہ استعارے بھی

غزلیں

میرا یہ خواب تھا کہ فریبِ حواس تھا
میرے خیال میں جو مرا غم شناس تھا

خوش تھے تماشا گاہ کے سب لوگ اور میں
تنہا بھرے ہجوم میں کتنا اداس تھا

اس کو ستم بتاؤں کہ مولا ترا کرم
وہ ریشمی بدن تھا مگر بے لباس تھا

ہر پھول تیرا عکس سراپا لگا مجھے
جیسے تو رنگ و نور تھا خوشبو تھا باس تھا

جب مجھ کو تیری یاد ہی آئی نہیں تو پھر
یہ کیسا سایہ تھا جو مرے آس پاس تھا

سرشار میرے شہر میں جو رونما ہوا
یہ حادثہ تو کب سے قرینِ قیاس تھا

اکرام الحق سرشار

ہر چیز میں وہ حسن کا پیکر دکھائی دے
کوئی بھی شے نہ اس کے برابر دکھائی دے

دیوار ہے نہ در ہے نہ سایہ نہ سائباں
یہ دشتِ بے کسی تو مرا گھر دکھائی دے

وہ پھول ہونٹ ایسے مسلط ہیں ذہن پر
کمرے کی خامشی بھی سخن ور دکھائی دے

سرشار! یہ تپا ہوا موسم یہ ریگزار
یہ دھوپ تو تمہارا مقدر دکھائی دے

غزل

آدھا کیا ہے غُصّہ تو آدھا نہیں کیا
تُو نے تو مُجھ سے جھگڑا بھی پُورا نہیں کیا

تُو نے کہا بُرا ہی کیا میں نے تیرے ساتھ
میں نے تو اپنے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا

تُجھ سے جُدا ہُوا ہوں میں، تیرا خیال ہے
خُود کو ترے خیال سے تنہا نہیں کیا

ہو گی کوئی تو بات ، جو گُزری ہے ناگوار
یُوں ہی تو میں نے شوق سے ایسا نہیں کیا

تُو نے سُنا دی سارے زمانے کو داستاں
مَیں نے تو دِل کا بوجھ بھی ہلکا نہیں کیا

کیفی یہ اور بات ، نہیں کر سکا وفا
وعدہ مگر کبھی کوئی جُھوٹا نہیں کیا

محمود کیفی

غزل

مشکل ہے شور و غل، آسانی کی سمت جاؤ
معروف راستو ! ویرانی کی سمت جاؤ

زر مال ہی تو ہے تیرا موجبِ تعاقب
کچھ دور، بے سر و سامانی کی سمت جاؤ

چھوڑو یہ سبز گاہیں، اپنا لو دشت کوئی
یعنی کہ ایک اور نادانی کی سمت جاؤ

بے دست ہو گیا ہوں اس شاہکار کے بعد
بوسہ گزار اب پیشانی کی سمت جاؤ

ایسا نہ ہو کہ دامن بھر لو کسی کے خوں سے
مت بار بار تم ارزانی کی سمت جاؤ

ساگر بغاوتیں بھی دیتی ہیں کامرانی
تم رکھ رکھاؤ سے من مانی کی سمت جاؤ

ساگر حضور پوری

غزل

چند لمحوں کی ہمیں جس نے رفاقت دے دی
ہم نے تحفے میں اسے دل کی ریاست دے دی

ہم نے ہر چیز اسے حسبِ ضرورت دے دی
بھر گیا دل تو بچھڑنے کی اجازت دے دی

جب کبھی زیست کے لمحات کو تصویر کیا
اپنے زخموں کو بھی پھولوں کی علامت دے دی

بدگمانی سے تری ہار گیا میرا خلوص
جا تجھے آج سے نفرت کی اجازت دے دی

نیند ہی نیند میں طے کر لیے سارے رستے
اس نے جب خواب میں ملنے کی سہولت دے دی

میرے ہونٹوں پہ مرے دل کی تمنا مچلی
اس کے ہونٹوں نے محبت کی اجازت دے دی

میرے الفاظ میں ابلاغ نہیں تھا پہلے
اس نے پڑھ کر مرے لفظوں کو بلاغت دے دی

یہ جو لفظوں کا ہنر ہے یہ کوئی عام نہیں
یہ سمجھنا کہ تمہیں اپنی وراثت دے دی

اس لئے اُس کا بہکنا تھا یقینی اظہر
اُس کی اوقات نہ تھی جتنی محبت دے دی

اظہر کمال

غزلیں

ذہن کے خلاؤں میں پیار سوچتے رہنا
ریتلی زمینوں میں ہل بھی جوتتے رہنا

زندگی کی ہر منزل یوں لگی مجھے اکثر
جیسے بانجھ مٹی میں پھول سینچتے رہنا

بے بسی عقائد کی ، بے بسی روایت کی
جام ہاتھ میں لے کر جام دیکھتے رہنا

یہ بساطِ چاہت ہے یا بساطِ گردش ہے
آپ دور ہو جانا ، آپ کھینچتے رہنا

جس جگہ ملے تھے ہم، اُس جگہ پہ کیوں جائیں
پھر اُدھر چلے جانا، خود سے پوچھتے رہنا

یہ نشانی ہے کوئی گمشدہ فسانے کی
اک پھٹی سی خلعت کو ایسے اوڑھتے رہنا

ریاض ہمدم

فریبِ ماہ سے طوفاں اٹھا دیئے کس نے
مرے چکور کے پاؤں تھکا دیئے کس نے

شجر چھپائے ہوئے تھا وجودِ بو یحییٰ
بدن کی شاخ پہ آرے چلا دیئے کس نے

ہر ایک نیند ترے خواب سے بھری کیونکر
وصال و ہجر کے کونے ملا دیئے کس نے

تمام اسپِ تحیر میں دم بدم ڈوبے
چھڑی سے بارہ ذرائع بنا دیئے کس نے

یہ زرد پھول سا سورج سرِ غروبِ خلیج
یوں آنچ اشک کے اندر چھپا دیئے کس نے

سخن ہے کس کی تمنا کا منکشف قرمچ
تخیلات کے منظر سجا دیئے کس نے

وہ جس کی آنکھ میں شہوت تھی لے اڑا ہمدم
پھر اس کی آنکھ کے سورج بجھا دیئے کس نے

غزل

نت نئے انتشار سے نکلوں
میں بھی تیرے دیار سے نکلوں

آ ملوں باغیانِ شہر سے میں
دست بستہ قطار سے نکلوں

ہر طرف ہے مغالطوں کی دھول
کس طرح اس غبار سے نکلوں

یہ نہ دیدہ گرفت ڈھیلی پڑے
اس خلائی حصار سے نکلوں

مسئلے کائناتی بھی حل ہوں
داخلی خلفشار سے نکلوں

عین ممکن ہے پھر شمار مرا
میں اگر بیشمار سے نکلوں

ہے عجب دل شکستگی احمد
جیت کر بھی نہ ہار سے نکلوں

احمد محسود

غزلیں

زخم کو رنگِ بہاراں نہیں ملنے دیتے
غم زمانے کے کچھ آساں نہیں ملنے دیتے

جیسے ممتاز ہو تم یوں ہی تمہارے دکھ ہیں
غمِ دل میں غمِ دوراں نہیں ملنے دیتے

درد بڑھتا ہے تو دور آپ سے ہو جاتے ہیں
حسن میں رنگِ پریشاں نہیں ملنے دیتے

مجھ تک آنا ہے تو پھر آگ کے دریا سے گزر
بے تگ و دو کبھی انساں نہیں ملنے دیتے

پہلے ملنے نہیں دیتی تھی دلوں کی الجھن
اب ہمیں زیست کے طوفاں نہیں ملنے دیتے

عنبرین خان

دل میں باقی مغالطہ بھی نہیں
اب تو تم سے کوئی گلہ بھی نہیں

ان بہاروں کے شوخ رنگوں کا
اجڑے گلشن سے واسطہ بھی نہیں

پاس آنے کی بھی طلب نہیں اب
دور جانے کا ماتا بھی نہیں

کھلبلی دل میں کیوں مچی ہوئی ہے
درد اپنا نیا نیا بھی نہیں

جس طرح چاہا آپ کو ہم نے
اس طرح کوئی پوجتا بھی نہیں

دستکیں اچھی اب نہیں لگتیں
جب تعلق کوئی رہا بھی نہیں

عنبرین اس طرح ملا ہے مجھے
جیسے وہ شخص جانتا بھی نہیں

غزل

ہم نے سوچا خیال درد کا ہے
انکو شاید ملال درد کا ہے

اب تو ہے مشک سے گرا پانی
اب تو جینا محال درد کا ہے

مالِ دنیا ستا نہ مومن کو
تیرا حسن و جمال درد کا ہے

اب رکے گا کبھی نہ روکے سے
میرے خوں میں ابال درد کا ہے

ہم کو فرقت نے تو نہیں مارا
ہاں مگر یہ وصال درد کا ہے

دیر تک منتظر رہے ہیں ہم
کیا وہ پوچھے ، کہ حال درد کا ہے

زخم سہتے رہے ہیں ہنس ہنس کے
اب کہ صاحب سوال درد کا ہے

ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جائے گا
آ یہ تحفہ سنبھال درد کا ہے

حالِ دل چشمِ تر نے کہہ ڈالا
یہی سارا وبال درد کا ہے

اب کے مولا اتارنا خوشیاں
یہ جو بیتا ہے سال درد کا ہے

ختم کر آرزو کے پھندے کو
میرے مولا یہ حال درد کا ہے

خالق آرزو

غزل

یہ میرا تخیل ہے، بصارت کا گماں ہے
منظر کوئی اک اور بھی منظر میں نہاں ہے

الفاظ بھی شرمندۂ معنی ہیں یہاں پر
اس شہر کو گفتار کی تہذیب کہاں ہے

کتنی ہیں سکوں بخش مرے گاؤں کی شامیں
اور دل میں اترتی ہوئی مغرب کی اذاں ہے

الفاظ کا محتاج کہاں دل کا تکلم
دھک دھک کی صدا ایک الگ طرزِ بیاں ہے

جانو گے تو چپ شور کی ہمراز ہو جیسے
سمجھو گے تو تسکین بھی وحشت میں نہاں ہے

ہر شخص کا اپنا ہے الگ شیش محل ایک
ہر شخص سمجھتا ہے کوئی مجھ سا کہاں ہے

رہبر ہمیں کس موڑ پہ لے آئے ہیں یارو
تا حدِ نظر صرف دھواں اور دھواں ہے

ظلمت پہ یہ چپ جرم ہے بلکہ ہے مہا جرم
اور جرم کا اس شہر کو احساس کہاں ہے

محمد نور آسی

غزل

ساحل سے سمندر کا تو رشتہ ہے پرانا
تم بھول گئے میری طرف لوٹ کے آنا

رکھنا ہے تمھیں یاد ہر اک بات بھلا کر
میں بھول بھی جاؤں تو مجھے یاد دلانا

اک شخص کی امید میں کھوئے ہوئے رہنا
اک یاد کی دہلیز پہ دن اپنا گنوانا

ہم جاگتے لمحوں میں تمھیں بھول چکے ہیں
سو جائیں تو ہرگز نہ کبھی خواب میں آنا

تم موجِ ہوا ہو مجھے معلوم ہے، لیکن
دیکھو، یہ مری شمعِ تمنا نہ بجھانا

جب کچھ نہ ترے پاس رہے غم کے علاوہ
اک ہجر پرانے میں نیا ہجر ملانا

رکھا نہ بھرم اس نے سحر میری وفا کا
کہتی بھی رہی میں کہ مرا ساتھ نبھانا

نادیہ سحر

غزل

دل فُسردہ تھا اور جاں! خوش تھی
کون کہتا ہے وہ یہاں خوش تھی

وہ مجھے چھوڑ کر اگر خوش ہیں
وہ مرے ساتھ بھی کہاں خوش تھی

میں اسے بھیج کر بہت خوش ہوں
اے مرے دوست! وہ جہاں خوش تھی

دل مجھے پوچھتا ہے خوش تھی وہ
میں اسے کہہ رہا ہوں ہاں، خوش تھی

میرے جانے پہ سب کو علم ہوا
کس کے ہونے سے میزباں خوش تھی

کر کے رُخصت اسے زبردستی
کہہ رہا ہے یہ خانداں، خوش تھی

بدگمانی بہت بری شے ہے
میرے رونے پہ بدگماں خوش تھی

امتیاز انجم

غزلیں

خود فراموش زندگی گزری
گردشِ صبح و شام بھول گیا

خواہشوں کے اسیر خوابوں نے
جو بچھایا تھا دام، بُھول گیا

خوش خرامی پہ اپنی نازاں تھا
وقت ہے تیز گام، بُھول گیا

پختگی کے فریب میں آکر
اپنی ہستی ہے خام، بُھول گیا

صبح سے شام تک رہا مصروف
جو ضروری تھا کام، بُھول گیا

دنیا داری کی حرص میں جاوید
آخرت کا پیام بھُول گیا

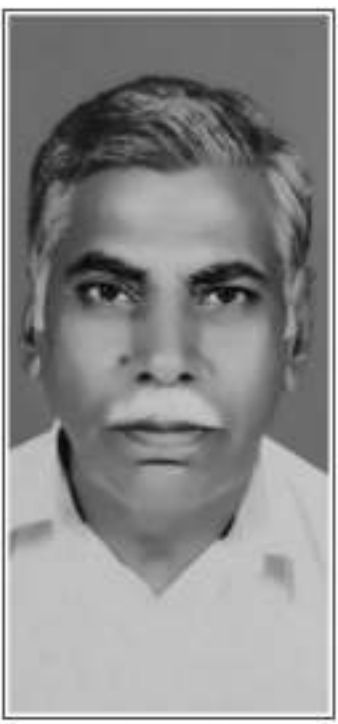

جاوید عباس

بنتا ہوں ایسے رات کو نغمے عجیب سے
گُذری ہو جیسے رات کی گاڑی قریب سے

اربابِ اقتدار نے گندم خرید کر
منہ کا نوالہ چھین لیا ہے غریب سے

ہر دور ایک رزم گہِ اضطراب ہے
ہر شخص لڑ رہا ہے خود اپنے نصیب سے

مُدت سے جن لبوں پہ خموشی کی مہر تھی
محفل میں آج بولے ہیں بن کر خطیب سے

شاید بیانِ عظمتِ انساں کے باب میں
کچھ بُھول ہوگئی ہے ادب اور ادیب سے

جاوید آج آئنہ دیکھا ہے غور سے
دل خوش ہوا ہے مل کے پُرانے رقیب سے

غزل

بانہوں کے کسی ہار کی محتاج نہیں ہے
چاہت ہے یہ اقرار کی محتاج نہیں ہے

دیوار اٹھاتے ہوئے یہ سوچ تو لیتے
خوشبو کسی دیوار کی محتاج نہیں ہے

اک روز میں آئی تھی اُسی آنکھ کی زد میں
وہ آنکھ جو تلوار کی محتاج نہیں ہے

تم میری محبت کو پڑھو آنکھ میں میری
یہ پیار کے اظہار کی محتاج نہیں ہے

خالص ہو تو ہو جائے کسی سے یہ محبت
اِس عہد کے معیار کی محتاج نہیں ہے

محبوب کی صورت کا اگر نقش ہو دل پر
پھر آنکھ تو دیدار کی محتاج نہیں ہے

احسان نہیں چاہیے یہ سن لو رشا بھی
مانگے ہوئے اس پیار کی محتاج نہیں ہے

آمنہ روشنی رشا

سفر تمام ہوا ہمرہاں بدلتے ہوئے (توصیف تبسم صاحب کی یادیں)

اِدھر دفتر میں لنچ بریک کا وقت ہوا اور اُدھر واٹس ایپ پر کال کی گھنٹی بجنے لگی۔ سکرین پر روشن سرخ اور سبز دائروں میں سے سبز پر شہادت کی انگلی پھیری اور رابطہ قائم ہو گیا:

''ہیلو، السلام علیکم۔ کیا حامد یزدانی صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟ میں توصیف تبسم بول رہا ہوں اسلام آباد سے۔'' دوسری طرف سے ایک مشفقانہ آواز کہہ رہی تھی۔''

''وعلیکم السلام، ڈاکٹر توصیف تبسم صاحب۔ میں، حامد یزدانی ہی بات کر رہا ہوں اور خوش گوار حیرت سے بھرے اِس اعزاز پر نازاں ہوں کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔''

میں اس غیر متوقع کال پر فی الواقع بوکھلایا ہوا تھا۔ مجھے تو بس ہلکا سا لنچ کر کے آج بھی دفتر کے نواح میں واقع جھیل کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ٹھنڈی ریت اور اٹھلاتی لہروں سے ہم کلام ہونا تھا۔ اور ایک بجے سے پہلے دفتر لوٹ آنا تھا مگر میں محوِ گفتگو تھا حرف و سخن کے اُس بیکراں سمندر سے جس کی روانی سے کئی نسلوں نے اپنے تخلیقی سفر کا رُخ متعین کیا۔

''بھئی، میں تو کئی روز سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر آپ کا نمبر میرے پاس نہ تھا۔ لاہور فون کیا نوید صادق صاحب کو اور آپ کا نمبر حاصل کیا۔ نوید صادق صاحب نے اپنے رسالے کارواں کا جو خصوصی شمارہ میرے حوالے سے شائع کیا ہے ابھی کچھ دن ہوئے وہ مجھے ملا۔ آپ کا اس میں کافی حصہ ہے۔ مجھے یاد ہے میری نذر ایک غزل ہے، ایک مضمون ہے میری غزلوں کے بارے میں اور پھر ایک نظم بھی۔ بس جی چاہا کہ آپ سے بات کروں اور خود شکریہ ادا کروں۔''

توصیف تبسم صاحب کہہ رہے تھے اور میں بس خاموش تھا۔ کہتا بھی تو کیا؟

''یہ تو سراسر میرا اعزاز ہے کہ مجھے آپ کے بارے میں کچھ لکھنے کا موقع ملا۔ میں آپ کا پرانا مداح ہوں۔'' آخر میں نے ہمت مجتمع کر کے کہا۔

حامد یزدانی

"آپ کا نام بھی میرے لیے اجنبی نہیں۔ ہم لکھنے والے سب ایک ہی خاندان کے افراد تو ہیں۔ میں نے آپ کی اور تخلیقات بھی ادبی جرائد بھی دیکھی ہیں اور شاید یہ جان کر آپ کو حیرت ہو کہ میں آپ کے والد یزدانی جالندھری صاحب کے فن کا بہت مداح ہوں۔ خاص کر اردو غزل میں جس شائستگی سے انھوں نے کام کیا ہے وہ تعریف کے لائق ہے۔ ویسے میری ان سے زیادہ ملاقاتیں نہیں رہیں۔ لیکن میں نے کہا نا کہ ہم لکھنے والے ایک ہی فیملی ہیں۔ ملیں یا نہ ملیں رشتہ تو بہرحال ہوتا ہے۔ آپ سے بھی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ پاکستان جب بھی آنا ہو مجھے ملے بغیر مت واپس جایئے گا۔"

توصیف صاحب کی آواز میں بے انتہا خلوص اور محبت تھی۔

"جی، ضرور۔ جب بھی اُدھر آنا ہوا، شرف ملاقات حاصل کروں گا مگر جی چاہتا ہے کہ آپ سے یہ بات شیئر کروں کہ میں آپ سے مل چکا ہوں۔" میں نے اپنی یادوں کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "بہت سال پہلے کی بات ہے۔ شاید انیس سو ترانوے کی۔ میں جرمنی سے تازہ تازہ واپس لوٹا تھا اور آپ ایک ادبی تقریب میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے ہوئے تھے۔ یہ تقریب ایک فائیو سٹار ہوٹل میں تھی۔ وقفہ ہوتے ہی میں ہوا خوری کے لیے ہال سے باہر نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ آپ نیچے زینے کے پاس ایستادہ ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے دکھائی دیئے۔ میں نے سلام کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ آپ نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا۔ یہ میری آپ سے پہلی بالمشافہ ملاقات تھی۔ میں نے ارزہ تعارف اپنا نام بتایا اور شکریہ ادا کیا کہ آپ نے اکادمی ادبیات کے لیے آفتاب اقبال شمیم صاحب کے ساتھ مل کر منتخب پاکستانی نظموں کا جو انتخاب ترتیب دیا تھا اس میں میری ایک نظم بھی شامل کی۔ مجھے یاد ہے آپ نے فرمایا تھا کہ شکریہ کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ نظم میرٹ پر شامل ہوئی ہے۔ ہمارا تو تعارف آج ہو رہا ہے۔ آپ کے استفسار پر میں نے عرض کیا تھا کہ وہ نظم میں نے جرمنی سے ماہ نامہ افکار کراچی کو بھیجی تھی۔ اور اسی دوران میں پھر کچھ اور احباب آپ سے ملنے آ گئے تھے تو میں نے رخصت لے لی تھی۔"

"بھئی واہ۔ آپ کو یہ تفصیلات یاد ہیں مگر مجھے یاد نہیں۔ ہاں مجھے یہ ضرور یاد ہے کہ اُس انتخاب کے لیے آفتاب اقبال شمیم اور میں نے الگ الگ اور مل کر لاتعداد رسالوں اور کتابوں کو کھنگالا تھا اور منتخب نظموں کا ایک رجسٹر تیار کیا تھا۔ اس انتخاب پر باقاعدگی سے تبادلہ خیال کرنے کے باوجود حتمی انتخاب سے قبل پھر طویل مکالمے ہوئے۔ کافی توجہ سے کیا تھا ہم نے وہ کام تاکہ جدید تر اردو نظم کا ہر ممکن نمائندہ انتخاب سامنے لا سکیں۔ اشاعت کے بعد پاکستان سے باہر یعنی بھارت میں بھی اس کی پزیرائی ہوئی۔ اس بات

پر دل کو طمانیت حاصل ہوئی۔'' توصیف صاحب نے نرمی سے کہا۔

''ظاہر ہے وہ ایک تقریب میں ہوئی، سرسری سی ملاقات تھی اور پھر اس کے بعد رابطہ ہی نہیں ہوا تو اس کا ذہن سے اتر جانا کچھ عجب نہیں مگر میں آپ کی تحریروں کی وساطت سے تو آپ سے مسلسل ملتا رہتا ہوں۔ آپ سے غائبانہ تعارف گورنمنٹ کالج لاہور کے دنوں میں شاہد ملک صاحب کے ذریعہ ہوا تھا۔ اور پھر ادب سے وابستگی کی بدولت آپ سے ایک تخلیقی قُرب قائم ہوتا چلا گیا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا، تو آپ شاہد ملک کو جانتے ہیں۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔'' ان کے لہجہ سے خوشی جھلک رہی تھی۔

''جی، وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں میرے انگریزی کے استاد تھے۔ ہوتے ہوتے یہ تعلق ایک بااحترام دوستی میں بدل گیا۔ وہ راولپنڈی، اسلام آباد اور واہ کی ادبی محفلوں اور شخصیات کا اکثر ذکر کیا کرتے۔ آپ اور آفتاب اقبال شمیم صاحب تو، ظاہر ہے، ان تذکروں کا لازمی حصہ ہوتے تھے۔ وہ بھی آپ کی تخلیقات کو اعلیٰ تخلیقی معیار کا پیمانہ قرار دیتے تھے۔'' میں نے اپنی یادیں شیئر کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو احباب کی محبت ہے بس۔ سچ پوچھیں تو جتنا کام کرنا چاہیے تھا اتنا نہیں کیا۔ اس بات پر تاسف رہتا ہے۔ زندگی کے جھمیلوں نے بہت کچھ کرنے ہی نہیں دیا۔ اور زندگی گزر گئی۔ اب نئی نسل کو لکھتے ہوئے دیکھتا ہوں تو جی خوش ہوتا ہے۔ کیا آپ کا کوئی شعری مجموعہ شائع ہوا؟'' توصیف صاحب نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''جی، میرے دو مجموعے اردو نظموں اور غزلوں کے، ایک نعتیہ مجموعہ اور ایک پنجابی شاعری کا مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔ تازہ شعری مجموعہ اور افسانوں کی کتاب بھی اشاعت کے لیے تیار ہے۔'' میں نے عاجزی سے جواب دیا۔

''کیا مجھے بھیج سکتے ہیں یہ کتابیں؟'' توصیف صاحب نے استفسار کیا۔

''افسوس، میری یہ کتابیں تو آوٹ آف پرنٹ ہیں۔ پھر بھی کوشش کرتا ہوں کہ ایک ایک کاپی آپ کو بھجوا سکوں۔ آپ کی نظر سے گزریں گی تو مجھے خوشی ہوگی۔'' میں نے عرض کیا۔

پھر انھوں نے میری کینیڈا میں مصروفیات کے بارے میں پوچھا۔ کچھ اپنی صحت کے حوالہ سے بات کی اور رابطہ رہنے کی امید کے اظہار کے ساتھ گفت گو منقطع کر دی۔

یوں تو صیف صاحب سے رابطے کا ایک باب کوئی دو تین برس قبل آغاز ہوا۔ سال رواں کے اوائل میں اُن کی غزلیات کے مجموعہ ''کوئی اور ستارہ'' کے بارے میں میرا مضمون ماہ نامہ بیاض' لاہور میں شائع ہوا تو پھر توصیف صاحب نے یاد فرمایا۔ شام کا آخری پہر تھا جب ان کا فون آیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد کہنے لگے:

'' آپ کا مضمون میں نے بھی پڑھا اور

احباب نے بھی۔ بہت اچھا لگا بلکہ بہت خوب صورت لگا۔ میری خواہش ہے کہ ایک ایسا ہی مضمون آپ میری نظموں پر بھی لکھیں۔"

"جی ضرور۔ میں یہ اعزاز بھی حاصل کرنا چاہوں گا۔ مجھے دلی خوشی ہے کہ آپ نے مجھے اس لائق جانا۔" میں نے جواباً کہا

اس پر توصیف صاحب نے ازرہ حوصلہ افزائی چند توصیفی جملے فرمائے۔ پھر اپنی صحت کا ذکر کیا۔ منیر شکوہ آبادی پر اپنے پی ایچ ڈی مقالہ کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے خود پر لکھے جانے والے تحقیقی مقالہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے "کارواں" جریدہ میں شائع ہونے والا میرا مضمون اور نظم بھی مقالہ نگار طالب علم کو دی ہے۔ یہ سن کر، ظاہر ہے، میرا دل بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے ادبی محفلوں میں کم کم شرکت کرنے کی بات کی۔ احباب سے گھر پر ملاقاتوں کی یادیں تازہ کیں اور پھر کہنے لگے:

"لیکن اچھی بات یہ ہے کہ میں لکھتا رہتا ہوں۔ کبھی غزل، کبھی نظم — لیجیے چند شعر آپ کو سناتا ہوں۔ گذشتہ دنوں ایک محفل میں سنائے تو دوستوں کو بہت پسند آئے۔ جی چاہ رہا ہے آپ کو بھی سناؤں۔"

"جی بسم اللہ — ارشاد۔" میں نے ادب سے کہا اور انھوں نے یہ اشعار عطا کیے:

گماں یقیں سے، یقیں سے گماں بدلتے ہوئے
سفر تمام ہوا ہم سفر بدلتے ہوئے

گرفت میں نہیں آیا وہ وصل کا لمحہ
گزر گیا تو لگے جسم و جاں بدلتے ہوئے

نظر میں سات سماوات تھے مگر میں تو
زمیں پہ آن گرا آسماں بدلتے ہوئے

وہ مٹیاں، وہ دریچے، وہ آس پاس کے لوگ
بھلے لگے تھے ہمیں کیوں مکاں بدلتے ہوئے

.....

میں نے مؤدبانہ داد نذر گزاری۔ مجھے اس وقت یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ ڈاکٹر یونس خیال صاحب نے کچھ عرصہ قبل جب "خیال نامہ" میں توصیف تبسم صاحب کی ایک خوب صورت غزل قارئین کی نذر کی تھی تو میں نے ایک مختصر سے نوٹ میں اپنے دل کی بات کہی تھی:

"محترم توصیف تبسم ہمارے عہد اظہار کی ترجمان صدا ہیں۔ ان کی غزل کا ہر شعر منفرد و منتخب ہوتا ہے۔ مضامین کا تنوع اور اظہار کی رنگا رنگی ان کی غزل کو سدا بہار بنائے ہوئے ہے۔ غزل، کے اسلوب میں کھلی روایت کی دھیمی دھیمی لَو اور جدت کی چکاچوند کے باہم تال میل سے وہ آسمانِ ادب پر مصرع مصرع ایسی کرنیں تخلیق کرتے رہتے ہیں جن کی دل کشی ماند پڑنے کو نہیں۔ تلخ حقائق کے آہن کو بھی وہ ایک ہُنر ور سُنار کی طرح بہت پیار اور نرمی سے تخلیقی زیور میں ڈھالتے ہیں۔ زیور کا حسن دیکھ کر کاری گر کی نفاست تو ہر ایک کو دکھائی دیتی ہے لیکن شب خیال میں فن کی بھٹی سے چھنتی تپش اور رُوح پر جھیلی حرف حرف ضربوں کی خاموش بازگشت کم کم لوگوں کو سُنائی دیتی ہے۔"

مذکورہ غزل کے چند اشعار آپ بھی پڑھ لیجیے:

پچھلی شب جب یاد میں تیری آنکھ سے آنسو ٹپکا تھا
تارے بھی جھلمل کرتے تھے، چاند بھی تھا کچھ زرد بہت

پہلا لفظ محبت تھا جو ہم نے پہلی بار لکھا
اب تک یہ پوریں جلتی ہیں، دل میں بھی ہے درد بہت

وحشت میں جب ہاتھ اٹھا کر ہم نے رقص آغاز کیا
ایک بگولا اٹھ کر بولا: تم سے صحرا گرد بہت

افسوس کہ ان کی نظموں پر اپنا مضمون میں تا حال مکمل نہیں کر پایا۔۔۔
اور آج خبر آئی کہ صفِ ادب کا یہ درویش تخلیق کے ہمہ وقت وسعت پزیر دائروں میں دھیما دھیما رقص کرتا ہوا وہ لکیر عبور کر گیا جس سے آگے ابدی سکوں کی وادی کی سرحد آغاز ہوتی ہے۔
مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے تازہ شعری مجموعہ کا نام ''ہم ابھی رستے میں ہیں'' اُس نظم کے عنوان سے مستعار لیا تھا جو میں نے توصیف صاحب کے لیے ان کی زندگی میں لکھی تھی اور ان سے شاباش اور دعا پائی تھی۔ یہ نظم آج ان کو یاد کرتے ہوئے درج کر رہا ہوں:

ہم ابھی رستے میں ہیں

(جناب توصیف تبسم کے لیے)

اے امینِ بابِ حیرت!
ہم ابھی رستے میں ہیں
اس کھوکھلی عمروں کے مکتب سے ابھی چھٹی ملی ہے
وہ بھی آدھی۔۔۔
سو ہمیں جلدی سے
دروازے پہ کھینچی زرد زنجیریں مٹانا ہیں
سفر کی سمت آنا ہے
ہمیں پیکر تراشی کا ہنر
آنکھوں کو دیواروں میں چنوانے کا فن
امکاں کا لہجہ اور لہروں کا تلفظ سیکھنا ہے
اک بھنور سے اپنا ساحل چھیننا ہے
اور ستم یہ ہے کہ
ہم واقف نہیں دریا کے رستوں سے
بہت مدت سے غیر آباد اس پھیکی شفق کو پار کر پائیں
تو صحرا سے ملیں
اور اس سے آگے دُور۔۔۔ نیلی دھند میں
لپٹے ہوئے خطے کی سرحد
کوئی جنگل رات سا
ہم نے غلیلوں میں پرندے رکھ لیے ہیں
پتھروں سے جنگ ٹھہری ہے
ہَوا سے برسرِ پیکار
ان رنگیں پروں پر ثبت دل کی داستاں
اک زرد پتہ، سرنوشتِ جاں
کہ رقصِ غم زداں
ناداں بگولے کا تمسخر جھیلنا باقی رہا
اجلی مسافت کے صحیفے میں لکھی
بارش کی اس مبہم عبارت کی یہی تفسیر ہے
اے دل!
قدم لرزاں سہی
دیکھو، ادھر دیکھو
شکستہ حرف و معنی کے برش جیبوں میں اُڑسے ہیں
کئی پیلے سے بوسیدہ ورق
اور مٹتی جاتی روشنائی سے
خطِ مہتاب میں لکھے ہوئے
کچھ خواب
سب امید کے بستے میں ہیں
اے امینِ بابِ حیرت!
ہم ابھی رستے میں ہیں۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر توصیف تبسم: ایک روشن چراغ تھا، نہ رہا

قافلہء ادب کے شرکاء بھی ایک ایک کر کے اُٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ لگتا ہے زندگی آج تُم، کل ہماری باری ہے، کی روش پر گامزن ہیں۔ ضیا محی الدین، ڈاکٹر اجمل نیازی اور امجد اسلام امجد کو ابھی ہم نہیں بھول پائے تھے کہ ڈاکٹر توصیف تبسم زندگی کی 95 بہاریں دیکھنے کے بعد 5 اکتوبر 2023 کی صبح اسلام آباد میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رٰجِعُون۔ ان کے فرزندِ ارجمند اور میرے برادر محترم عارف توصیف نے اگر از خود مطلع نہ کیا ہوتا تو مجھے کبھی یقین نہ آتا کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں کیونکہ یہ خبر دینے سے چند گھنٹوں پہلے ہی انہوں نے بتایا تھا کہ قبلہ توصیف تبسم صاحب کی طبیعت پہلے سے بہتر ہے۔ مگر پھر انہوں نے دل دہلا دینے والی خبر دے دی۔ اس خبر سے دلی دُکھ پہنچا لیکن یہ بھی درست ہے کہ مجھ پر بہت سی حسین یادوں کی کھڑکیاں کھل گئی ہیں۔ (مرحوم و مغفور) کے ساتھ تقاریب میں جو ملاقاتیں ہوئیں، وہ ایک فلمی سین کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گھوم گئیں اور وہ مجھے اپنے پورے قد و قامت کے ساتھ پہلے کی طرح باوقار انداز میں کھڑے نظر آئے۔ بلاشبہ یہ ایک ایسی علمی اور ادبی شخصیت تھے، جن سے ہزاروں افراد نہیں، مختلف ادوار میں کئی نسلیں فیضیاب ہوتی رہیں اور انہوں نے نام بھی کمایا اور سوسائٹی میں احترام بھی۔ کچھ شخصیات اعلیٰ مناصب پانے کے بعد یہ کہتی بھی سنائی دیں کہ اگر ہمیں ڈاکٹر توصیف تبسم کی صحبتِ بابرکت میسر نہ آتی تو ہمیں وہ منزل ہی نہ ملتی، جس پر آپ آج ہمیں دیکھ رہے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں ہم لوگ راولپنڈی میں مقیم تھے اور میرے والد بزرگوار سید فخرالدین بلے شاہ تین وزارتوں کے ترجمان قومی جرائد ماہنامہ اوقاف، ماہنامہ ہم وطن اور ماہنامہ یارانِ وطن کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے اسلام آباد میں تعینات تھے۔ میرا بچپن تھا۔ ایک دن سہ پہر کے وقت ڈاکٹر توصیف تبسم اپنے چند ادب دوستوں کے ساتھ ہمارے گھر آئے۔ میرے والدِ بزرگوار بڑے تپاک کے ساتھ انہیں ملے اور پھر

ظفر معین بلے جعفری

اس قافلے نے گھنٹوں پڑاؤ ڈالے رکھا۔ اسی اثنا میں جدید شاعر شرافت اجمیری بھی تشریف لے آئے۔ ان کے آنے سے فضا مزید دلکش ہوگئی۔ نئے تنقیدی رجحانات اور موضوعات پر بڑی خوبصورت گفتگو سننے کو ملی۔ یہ ڈاکٹر توصیف تبسم سے بالمشافہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس ملاقات کے نتیجے میں ان کی شخصیت، فکر، فن اور سخن کے بہت سے پہلو مجھ پر کھل گئے۔ میں نے جان لیا کہ ڈاکٹر توصیف تبسم قادرالکلام شاعر، کہنہ مشق ادیب، ممتاز اسکالر اور معروف دانشور ہی نہیں بہت کچھ ہیں۔ استاذ الاساتذہ کی حیثیت سے برس ہا برس علم و عرفان کے گوہر لٹاتے رہے ہیں اور ان کی قابلیت، تعلیم اور تربیت سے کئی نسلیں مستفید و مستفیض ہوتی رہی ہیں۔ نظم اور غزل دونوں مقبول اصناف سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی اور شاہکار ادب تخلیق کیا۔ ان کا شمار معتبر ناقدین اور ادبا میں ہوتا ہے اور دنیائے اردو ادب میں ان کا تذکرہ تعظیم و تکریم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر توصیف تبسم کا کلام ہمارا گراں قدر سرمایہ ہے۔ ہتھیلی پر لکھی نظمیں ڈاکٹر توصیف تبسم کی شاہکار نظموں کا مجموعہ ہے۔ اور یہاں ان کے شعری مجموعے کوئی اور ستارہ کا تذکرہ کرنا یقیناً بے محل نہ ہوگا۔ لیکن اپنی تنگ دامانی اور بے بضاعتی کا بھی مجھے احساس ہے، لہٰذا جب موقع ملے آپ اس کتاب سے اپنے ذوق کی تکمیل کا سامان ضرور بہم پہنچایئے گا۔

محترم عارف توصیف صاحب کو کافی حد تک سید فخرالدین بلے شاہ اور ڈاکٹر توصیف تبسم کے مراسم، روابط، تعلقات اور رفاقت کا اندازہ ہے۔ ہم اپنا شمار ان خوش نصیبوں میں کرتے ہیں جو مسلسل ڈاکٹر توصیف تبسم کی دعاؤں سے براہ راست فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ ہمارا ان سے فون پر مسلسل رابطہ تھا۔ وہ ہمیشہ ہمیں اپنی انمول دعاؤں سے نوازتے تھے اور اپنی ادبی زندگی کے رفیق قبلہ سید فخرالدین بلے شاہ صاحب اور ان کی ادبی و ثقافتی خدمات کو شاندار الفاظ میں خراج محبت پیش کرتے تھے۔ ان سے اپنے بابا سائیں سید فخرالدین بلے کا انتہائی احترام کے ساتھ تذکرہ سن کر ہمیں ہمیشہ یاد آتا کہ ہمارے والد تو خود ڈاکٹر توصیف تبسم کا بے حد احترام فرماتے تھے اور ہمیشہ توصیف بھائی صاحب کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے اور ان کی تخلیقات کا بھرپور تجزیہ فرمایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر توصیف تبسم کے فن اور شخصیت کے حوالے سے نوید صادق صاحب نے کارواں کا خصوصی شمارہ مرتب کیا۔ ہمیں یاد ہے ڈاکٹر توصیف تبسم صاحب سے جب بھی ملنے پر یا فون پر مکالمہ ہوا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دوران گفتگو انہوں نے آنس معین کے شعری تیور کے حوالے سے بات نہ کی ہو۔ آنس کا یہ شعر تو اکثر ان کی زبان پر آجایا کرتا تھا۔

حیرت سے جو یوں میری طرف دیکھ رہے ہو
لگتا ہے کبھی، تم نے سمندر نہیں دیکھا

.....

میں جب بھی ڈاکٹر توصیف تبسم سے ملتا، مجھے یہی لگتا کہ جیسے لب خاموش سے وہ مجھے مخاطب کرکے اپنے بارے میں کہہ رہے

ہوں۔ لگتا ہے کبھی تم نے سمندر نہیں دیکھا۔
ان کا اصل نام محمد احمد توصیف اور تخلص توصیف تھا۔ وہ 3 اگست 1928 کو بدایوں کے ایک قصبہ سہسوان میں پیدا ہوئے۔ بھارت دو حصوں میں بٹا تو ان کا گھرانہ پاکستان آبسا۔ انہوں نے راولپنڈی گورڈن کالج سے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ ''منیر شکوہ آبادی'' پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ نظم بھی کہتے تھے مگر غزل ان کی محبوب صنف سخن رہی۔ مقتدر ادبی رسائل میں آپ کا خوبصورت کلام چھپتا رہا۔ ان کی شناخت ایک مبصر کی حیثیت سے بھی رہی۔ ''کوئی اور ستارہ'' کے نام سے ان کے شعری مجموعے پر انہیں علامہ اقبال ہجرہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ ''مثنویات دہلی کا تہذیبی و معاشرتی مطالعہ'' کے موضوع پر بھی تحقیقی مقالہ لکھ کر تہلکہ مچا چکے ہیں۔ پاکستان ہی نہیں، جہاں جہاں اور جس جس شہر میں ادب دوست موجود ہیں، وہاں آپ کو ڈاکٹر توصیف تبسم کے چاہنے والے ضرور ملیں گے۔۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہنے والے ممتاز شاعر اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر اسعد بدایونی (مرحوم) پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر اسعد بدایونی بہت جلد داغ مفارقت دے گئے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ جدید تر غزل کا شناخت نامہ کے عنوان کے تحت پاک و ہند کے ممتاز شعرا کی غزل گوئی کے حوالے سے اپنے لکھے ہوئے تنقیدی مضامین کو یکجا کر رہے تھے۔ آنس معین۔ ایک اچھوتی اور نرالی طرز سخن کا بانی، ڈاکٹر توصیف تبسم۔ جدید اردو غزل کا ایک بڑا نام اور سید فخر الدین بلے۔ اردو غزل کا معتبر حوالہ اور خالد احمد۔ جدید اردو غزل کا توانا شاعر جیسے دیگر مقالات و مضامین کو اپنے مجموعے میں شامل کرنا چاہ رہے تھے اور بقول پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم ترتیب و تدوین کا کام مکمل کرتے ہی وہ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

توصیف تھے ادب کی، تبسم تھے سخن کا

.....

محترم پروفیسر ڈاکٹر توصیف تبسم صاحب کو دنیائے اردو ادب میں جو مقبولیت، شہرت اور نیک نامی حاصل ہوئی، یہ بہت کم خوش نصیبوں کو میسر آتی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ مناظر بھی گھوم رہے ہیں کہ جب محترم توصیف تبسم صاحب لاہور تشریف لائے تو ماہنامہ ادب لطیف کی مدیر اعلیٰ محترمہ صدیقہ بیگم اور مدیر ماہنامہ تخلیق جناب اظہر جاوید نے یہ خبر ملتے ہی سید فخر الدین بلے صاحب کی اقامت گاہ پر پہنچنے کی کوشش کی لیکن ہمارے پیارے مدیر ماہنامہ بیاض برادر محترم جناب خالد احمد بازی لے گئے اور برادرم ڈاکٹر محمد اجمل خان نیازی کے ہمراہ سب سے پہلے تشریف لائے۔ ڈاکٹر وحید قریشی، جناب مسعود اشعر اور امرار زیدی ہی نہیں بلکہ شہزاد احمد صاحب بھی بلا تاخیر پہنچنے والوں میں سرفہرست رہے۔ اس تمام تر ہیجڑ بڑ کی وجہ یہ تھی کہ جناب توصیف تبسم صاحب کی لاہور میں کئی اور بھی نجی نوعیت کی مصروفیات تھیں اور انہوں

نے ازراہِ کرم اپنے محب جناب سید فخر الدین بلے صاحب کی خواہش کے احترام میں تین، چار گھنٹے ادبی تنظیم قافلہ کے پڑاؤ کے لیے مختص فرمائے۔ ادب کے حوالے سے ان سے بہت سے موضوعات پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ ارباب ادب نے ان سے بہت سی نظمیں اور غزلیں سن کر اپنی علمی پیاس بجھائی۔ تمام مستقل شرکائے قافلہ پڑاؤ نے ڈاکٹر توصیف تبسم صاحب کی کرم فرمائی کا شکریہ ادا کیا۔ کچھ نے ان کے ساتھ اپنی خوشگوار یادوں کو تازہ کیا اور ان سے جلد ہی دوبارہ لاہور میں قافلہ پڑاؤ میں شرکت کا مطالبہ بھی کیا۔ ارباب ادب کے اصرار پر ڈاکٹر توصیف تبسم نے قافلے کی دعوت پر پڑاؤ میں شرکت کا یقین دلایا اور محض یقین ہی نہیں دلایا بلکہ ایفائے عہد میں تاخیر بھی نہیں ہونے دی اور چند ماہ بعد ہی سید فخر الدین بلے اور ادبی تنظیم قافلہ کو میزبانی کا اعزاز بخشا۔ سید فخر الدین بلے، جناب خالد احمد، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر اجمل نیازی اور جناب ڈاکٹر وحید قریشی نے بھرپور انداز میں ڈاکٹر توصیف تبسم صاحب کے مقام و مرتبے پر روشنی ڈالی اور ان کی ادبی خدمات کو بھرپور سلامی بھی دی گئی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ڈاکٹر توصیف تبسم بڑے با اخلاق، مروت کے پیکر، محبت کے خوگر، دوسروں کے کام آنے والے، ادب دوست اور ادبی گروہ بندیوں سے ہمیشہ بالاتر رہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ ادبی دنیا میں آپ کو صرف ان کے دوست اور چاہنے والے ہی ملیں گے، ان کی مخالفت میں زبان کھولنے والا کوئی نہیں ملے گا۔ محض اس لئے کہ جب کوئی مخالف ہے ہی نہیں تو مخالفت میں بات کیسے کر سکتا ہے؟

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

بہت سی ادبی تنظیموں نے ان کی رحلت پر تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے بھی اسلام آباد میں ان کی یاد میں تعزیتی ریفرنس کا اہتمام کیا اور نامور شاعروں، ادیبوں اور ناقدوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ڈاکٹر توصیف تبسم کی وفات سے ادبی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ تادیر پُر نہیں ہو سکے گا۔

میں ان کی ایک خوبصورت غزل پر اپنے مضمون کو ختم کر رہا ہوں، یہ غزل میں نے ان سے ایک محفل میں سنی تھی اور مجھے اس کی گونج سنائی دے رہی ہے، آپ بھی سنئے۔

کاش اک شب کے لیے خود کو میسر ہو جائیں
فرش شبنم سے اٹھیں اور گلِ تر ہو جائیں

دیکھنے والی اگر آنکھ کو پہچان سکیں
رنگ خود پردۂ تصویر سے باہر ہو جائیں

تشنگی جسم کے صحرا میں رواں رہتی ہے
خود میں یہ موج سمو لیں تو سمندر ہو جائیں

وہ بھی دن آئیں یہ بے کار گزرتے شب و روز
تیری آنکھیں، ترے بازو، ترا پیکر ہو جائیں

اپنی پلکوں سے جنہیں نوچ کے پھینکا ہے ابھی
کیا کرو گے جو یہی خواب مقدر ہو جائیں

جو بھی نرمی ہے خیالوں میں نہ ہونے سے ہے
خواب آنکھوں سے نکل جائیں تو پتھر ہو جائیں

☆☆☆☆☆

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

بعض تحریروں کا ظاہری مقصد اگرچہ تفنن طبع ہی کیوں نہ ہو لیکن ان کے بین السطور پیغام سے علمی لحاظ سے صرف نظر کرنا بھی محال دکھائی دیتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اپنے سفرناموں سے شہرت پانے والے ایک معروف لکھاری نے ایک معاصر ماہنامے میں یوں اظہارِ خیال کیا کہ ''الو جیسا شاہی وجاہت والا پرندہ دیکھ کر آپ شاہین وغیرہ کو بھول جائیں گے اور شاہین بھی تو چیل اور گدھ کی ذرا گلوری فائیڈ شکل ہے''۔ مزید فرماتے ہیں کہ ''چیل، گدھ اور عقاب کی آنکھوں میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ صرف علامہ اقبال کی شاعری کا فرق ہوتا ہے'' ۔ گویا بقول ان کے اقبال نے شاہین کو موضوعِ سخن بنا کر بلا وجہ اہمیت دے دی ہے ورنہ مردار خور گدھ، چیل اور چوہے خور الو وغیرہ جیسے پرندے شاہین سے زیادہ خوبصورت اور اہم ہیں۔ پرندوں کے درمیان اس مقابلۂ حسن میں انہوں نے الو کو تو شاہی وجاہت والا پرندہ اور گدھ اور چیل کو شاہین کے ہم مرتبہ پرندے قرار دیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ موصوف کی ان پرندوں کو ترجیح دینے کی وجہ ان کی ظاہری شکل و شباہت کے باعث ہے۔ اگرچہ گدھ جیسے مکروہ پرندے کے لئے موصوف کی پسندیدگی کے اظہار سے ان کے ذوق جمال کے متعلق کوئی ابہام نہیں رہتا تاہم اس بات کو فی الحال یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا علامہ اقبال کا ذوق جمال اتنا ہی پست تھا کہ انہوں نے مور، دراج (Pheasant) کبک اور چکور جیسے خوبصورت پرندوں کو مسترد کر کے شاہین کو مسلم قوم کے لیے علامتی پرندہ قرار دیا؟ کیا قومی پرندے کے انتخاب میں علامہ کا معیارِ انتخاب کسی پرندے کا ظاہری حسن و جمال تھا یا کچھ دیگر خصائل تھے؟ اس سوال کا نصف جواب تو علامہ کے اس شعر ہی سے مل جاتا ہے کہ:-

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

.....

یعنی علامہ کا معیارِ انتخاب نہ تو کسی پرندے کا ظاہری حسن و جمال اور دل خوش کُن رنگ و روپ تھا اور نہ ہی کسی پرندے کی سریلی من

حامد سعید اختر

موٹی آواز تھی بلکہ کچھ ایسی صفات تھیں جنھیں شجاعت، بے باکی، بے خوفی، قہر وقوت، شوکت وہیبت، دور بینی، تجسس، تیز نگاہی، زور بازو، بے نیازی اور مردار سے اجتناب کا مظہر سمجھا جا سکے۔ آگے بڑھنے سے پیشتر نباتات کی دنیا کے چند دلچسپ جینیاتی حقائق کا مطالعہ مفید مطلب رہے گا۔

ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں شاہی محل کے ایک ملازم پر چوری کا مقدمہ چل رہا تھا۔ ہر جانب سے اُس پر لعن طعن ہو رہی تھی کہ اُس نے شاہی محل سے نوادرات کی چوری جیسی گھٹیا حرکت کیوں کی۔ جب وہ یہ دباؤ برداشت نہ کرسکا تو اُس نے خودکشی کی ٹھانی اور رات کے وقت شاہی باغیچے سے ٹماٹر توڑ کر کھا لئے اور بزعم خویش خودکشی کر لی لیکن اگلی صبح وہ صحیح سلامت آنکھیں ملتا ہوا بیدار ہو گیا۔ بعد ازاں وہ چوری کے الزام سے بری ہو گیا کیوں کہ چور کوئی اور شخص نکلا۔ تب اُس نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ اُس نے ڈھیر سارے ٹماٹر کھائے تھے لیکن اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس واقعے کے بعد ماہرین نباتیات نے تحقیق کی تو ٹماٹر کا نام زہریلے پھلوں کی فہرست سے نکل کر صحت بخش سبزیات میں شامل ہو گیا۔

قارئین کے لئے یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ تب تک ٹماٹر کو انتہائی زہریلا پھل سمجھا جاتا تھا اور اس کی کاشت صرف آرائشی مقاصد کے لئے گملوں میں کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹماٹر نباتات کی اُس قسم سے تعلق رکھتا ہے جسے ”نائٹ شیڈ Night shade“ کہا جاتا ہے۔ بیلا ڈونا (Belladonna) کا پودا بھی اسی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے پودوں، پتوں اور پھل کی ساخت ٹماٹر کے مماثل ہے۔ بیلا ڈونا ایک مہلک زہر ہے لہٰذا ٹماٹر کو بھی زہریلا پھل ہی سمجھا جاتا تھا۔ آج ”بیلا ڈونا پلاسٹر“ درد کش اثرات کی وجہ سے عام استعمال میں ہے اور اس کے الکلیاں درجنوں امراض میں استعمال کی جا رہی ہیں۔ اس تحقیق کے بعد بیلا ڈونا اور ٹماٹر میں امتیاز کی خاطر بیلا ڈونا کو (Deadly Night Shade) یعنی مہلک نائٹ شیڈ کا نام دے دیا گیا۔ تحقیق کا دائرہ مزید وسیع ہوا تو معلوم ہوا کہ آلو، بینگن، ٹماٹر اور نائٹ شیڈ کی نوع کے دیگر پودے دراصل ایک ہی نسل کے ذیلی پودے ہیں جسے سولینم (Solanum) کہا جاتا ہے۔ ٹماٹر کا نباتاتی نام سولینم لائیکو پرسی کم (Solanum Lyco Perclcum) جب کہ آلو کا نباتاتی نام سولینم ٹیوبرسم (Solanum Tubersum) ہے۔ یعنی فطرت نے انھیں ایک ہی نوع کے پودے کی کوکھ سے پیدا کیا ہے لیکن معمولی سی جینیاتی تبدیلی سے ان کا ظاہری رنگ روپ، ساخت، ذائقہ اور طبی وطبعی خواص تبدیل کر دیئے ہیں۔ اسی طرح مختلف انواع کے پھل،

پھول، سبزیاں و دیگر اجناس گوناگوں اقسام کی خوشبو، رنگت، ذائقے اور خصائص کی حامل ہیں۔ اسی لئے شناخت کی خاطر آلو، بینگن اور ٹماٹر کے نام بھی علیٰحدہ علیٰحدہ ہیں۔ آج مختلف انواع کے اثمار، اجناس اور سبزیات کی شناخت اور ان کے خواص کی نشاندہی ان کے معروف نام سے ہی ہوتی ہے اگرچہ ان کی جینیاتی اصل ایک ہی ہو۔ یہ امر بھی دل چسپی کا باعث ہوگا کہ تمبہ یا حنظل جیسی انتہائی تلخ نبات کا نباتانی نام Citrulus Colocynthis ہے اور تربوز جیسے شیریں اور مفرح پھل کا نام Citrulus Lanatus کیونکہ حقیقتاً یہ ایک ہی نسل Citrulus سے تعلق رکھتے ہیں لیکن قدرت کی جینیاتی انجینئرنگ نے انہیں مختلف خواص کی حامل اجناس بنا دیا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت حشرات الارض، حیوانات اور پرندوں وغیرہ کی ہے۔ مثلاً (شیر اور بلی)، (کبوتر اور فاختہ)، (گدھا اور گھوڑا) ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے طبعی خصائل بالکل الگ ہیں کیونکہ:

ہر کسے را بہر کارے ساختند

زیرِ نظر مضمون میں ہم صرف پرندوں کی ایک نوع تک محدود رہیں گے اور اس میں سے بھی خصوصی تذکرہ "شاہین" کا کیا جائے گا جو علامہ اقبال کی شاعری میں ایک علامتی پرندہ ہے۔ ویسے تو بحری ماہی خور (Sea Gull)، بگلا (Stork)، سارس (Crane)، چہا (Snipe)، ٹیٹری (Sand Piper)، رام چڑیا (King Fisher) جیسے پرندے بھی شکار کرتے ہیں لیکن یہ سطح آب کے قریب رہنے والے (Omnivorous) پرندے ہیں جو مچھلیوں اور مینڈکوں کے علاوہ کائی اور گھاس پھونس بھی کھاتے ہیں۔ ہمارے پیش نظر اونچی اڑان بھرنے والے شاہین صفت پرندوں کا ذکر مقصود ہے جو دوران پرواز غوطہ لگا کر فضا سے یا جھپٹ کر درختوں یا بحر و بر کی سطح سے قوت لایموت حاصل کرتے ہیں۔ مذکورہ پرندوں کی جینیاتی اصل کے متعلق ماہرین علم الطیور (Ornithologists) کی رائے ہے کہ گدھ، چیل، باز اور عقاب ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں یہ حقیقت ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے کہ تربوز اور تمبہ (انتہائی کڑوا جنگلی پھل حنظل، اندرائین) بھی ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ تربوز شیریں اور مفرح پھل ہے۔ اُس کے برعکس لیموں کی جسامت کا ایک تمبہ اگر کنویں میں پھینک دیا جائے تو کنویں بھر کا پانی ناقابل برداشت حد تک کڑوا ہو جاتا ہے۔ یہ قدرت کی جینیاتی کرشمہ سازی کا کمال ہے۔ لہٰذا گدھ، الو، چیل اور عقاب کے تبدیل شدہ جینیاتی خصائل اور خصائص ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ بالکل ویسے ہی جیسے کہ گدھا اور گھوڑا ایک ہی نسلی سلسلے سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنی عادات اور خصوصیات کے

حوالے سے بالکل مختلف ہیں۔ لہٰذا الو، چیل اور گدھ کا شاہین صفت پرندوں سے تقابل اور موازنہ کرنا ایک بے سروپا فعل ہے۔ ان پرندوں کو ان کے تبدیل شدہ جینیاتی خصائل Altered Genetic (Characteristics) کے معیار پر ہی دیکھا جائے گا۔ چیل (Kite)، گدھ (Vulture)، الو (Owl)، شکرہ (Sparrow Hawk)، عقاب (Eagle)، باز (Hawk)، شاہین (Falcon / Eyas)، شہباز (Royal Falcon / Harrier) سب بنیادی طور پر گوشت خور (Carnivorous) اور شکاری (Raptor) پرندے ہیں۔ الو ایک شبینہ شکاری (Nocturnal) پرندہ ہے جو عموماً چوہوں، مینڈکوں اور دیگر حشرات الارض کا شکار کرتا ہے۔ الو کی 200 سے زیادہ اقسام ہیں۔ گدھ اور چیل درحقیقت قدرت کی جانب سے صفائی پر مامور پرندے ہیں جو مردار اور متعفن اجسام کو کھا کر مزید تعفن اور بیماریوں کو پھیلنے سے روکتے ہیں۔ گویا یہ بنیادی طور پر مردار خور (Scavenger) پرندے ہیں۔ شکرہ جسامت کے لحاظ سے بمشکل کبوتر جتنا ہے اور چھوٹے پرندوں مثلاً چڑیوں وغیرہ کا شکار کرتا ہے۔ باز جسامت میں چیل سے قدرے چھوٹا ہے اور کبوتر اور فاختہ وغیرہ کا شکار کرتا ہے۔ بڑے باز کو شہباز (Royal Falcon) یا (Harrier) کہتے ہیں۔ شاہین بھی عقاب کے مماثل پرندہ ہے۔ شہباز کے نوجوان بچے (Falcon) کو بھی شاہین کہتے ہیں۔ عقاب (Black Eagle) اور شاہباز (Royal Falcon) میں بھی جسامت، رنگت اور خواص کا فرق ہے۔ شہباز کی چونچ اور پنجے بہت تیز و طاقت ور ہوتے ہیں۔ تیز رفتار اور باریک بین پرندہ ہے اور اسے پرندوں کے شکار کی خاطر سدھایا جاتا ہے۔ شاہباز اپنے پنجوں اور چونچ کی مدد سے اپنے شکار کی گردن توڑ دیتا ہے۔ اس کی ساٹھ معلوم اقسام ہیں۔ عقاب (Black Eagle) کا جثہ سب سے بھاری ہوتا ہے۔ رنگ سیاہی مائل بھورا، نگاہ بہت تیز اور پروں کا پھیلاؤ سب سے زیادہ ہے۔ انتہائی بلند پرواز اور تیز رفتار پرندہ ہے اس کے پنجے بہت طاقت ور اور گرفت بہت سخت ہے اس کی چوہتر معلوم اقسام ہیں۔ یہ درمیانی جسامت کی بھیڑ بکری اور ہرن کو بھی شکار کر لیتا ہے۔ عموماً یہ صحرائی سانپوں اور مچھلیوں کا شکار کرتا ہے۔ انتہائی اونچی اور ناقابل رسائی عمودی چٹانوں میں رہتا ہے۔ عقاب اور شاہباز میں بہت سی خوبیاں یکساں ہیں جو انہیں دیگر شکاری پرندوں سے ممیز کرتی ہیں تاہم کئی پہلوؤں سے شاہین کو عقاب پر فوقیت حاصل ہے۔ ان کی عمومی خوبیاں درج ذیل ہیں:-

1- عقاب اور شاہباز مردار ہرگز نہیں کھاتے بلکہ اپنا شکار خود منتخب کرتے ہیں۔ دونوں بہت صفائی پسند پرندے ہیں البتہ عقاب حریص الطبع اور خود غرض پرندہ ہے جو دوسروں سے اُن کا شکار بھی چھین لیتا ہے۔

2- دونوں بہت دور بین اور تیز نگاہ کے حامل ہیں اور ہزاروں فٹ کی بلندی سے شکار کو تاڑ لیتے ہیں۔ حملہ کرتے وقت شاہین کی رفتار 320 کلومیٹر ہوتی ہے اور یہ پانچ ہزار کلومیٹر کی مسافت طے کر سکتا ہے۔

3- دونوں بہت بلند پرواز اور تیز رفتار ہوتے ہیں۔ یہ پندرہ کلومیٹر اونچائی تک پرواز کر سکتے ہیں۔ (بغیر اضافی آکسیجن کے)۔ عقاب اپنے شکار پر 320 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جھپٹتا ہے۔ اس رفتار پر ہوائی جہازوں کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں اور انہیں جلنے سے بچانے کی خاطر خاص دھاتوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جن پر مانع حرارت کیمیائی مادوں کی تہہ جمائی جاتی ہے۔ لیکن قدرت نے عقاب کو اپنی تیز رفتاری کے باوجود جلنے سے محفوظ رکھا ہے۔ شاہین سریع الحرکت ہے اور اپنی تیز حرکت پذیری کے باعث عقاب کو بھی مات دے دیتا ہے۔

4- شاہین صفت پرندے گھونسلا نہیں بناتے بلکہ بلند و بالا چٹانوں پر یا درختوں کی کھوہ میں بسیرا کرتے ہیں۔

5- اپنے شکار کو ہر صورت زیر کر لیتے ہیں ان کا شکار مغلوب ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

6- بے جگری، بے باکی اور بے خوفی ان کا خاصا ہے۔

7- خلوت پسند ہیں اور باقی پرندوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔

8- بارش، آندھی اور طوفان اِن کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن پاتے۔

9- مسلسل محوِ پرواز رہتے ہیں اور تھکاوٹ کے باعث پرواز معطل نہیں کرتے۔

10- شان و شوکت، وقار اور فتح و نصرت کی علامت ہیں۔

11- اپنے مضبوط اور طاقتور بازوؤں کے بل پر اپنے سے کئی گنا وزنی جانور کو بھی شکار کر لیتے ہیں۔

12- شاہین صفت پرندوں کی ہڈیاں کھوکھلی اور وزن میں ہلکی ہوتی ہیں کیونکہ ان میں ہوا بھری ہوتی ہے جس کی وجہ سے اُن کی پرواز کرنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے انہی پسندیدہ خصائل کے باعث شاہین کو مسلمان قوم کے لئے علامتی پرندہ قرار دیا۔ لیکن شاہین کی ان خوبیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اگر کوئی شخص محض ظاہری شکل و صورت کی بنا پر چوہے خور الو کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہو تو اُس پر اقبال ہی کا شعر صادق آتا ہے کہ:-

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

ذیل میں علامہ کے چند منتخب اشعار دیئے جا رہے ہیں جن میں شاہین کی بلند پروازی، تیز نگاہی، ہمت، قوتِ پرواز، شکوہ، بے باکی، عزم و ہمت اور عظمت کا ذکر کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اقبال نے اپنے کلام میں ضرورت شعری کے باعث عقاب، شاہین، باز اور شہباز میں امتیاز روا نہیں رکھا تاہم عقاب (Eagle) کی کچھ ناپسندیدہ عادات بھی ہیں۔ اسی لئے اقبال کا پسندیدہ پرندہ

شاہین (Falcon) ہی ہے جس کا ذکر ان کے کلام میں بکثرت ملتا ہے۔ اقبالؒ نے باز اور عقاب کا ذکر اپنے کلام میں پانچ پانچ بار، شہباز کا گیارہ بار اور شاہین کا بتیس بار کیا ہے۔ گدھ، چیل، عقاب اور باز ایک ہی خاندان (Accipiter) سے تعلق رکھتے ہیں لیکن گدھ اور چیل مردار خور (Scavenger) پرندے ہیں جبکہ باقی سب تازہ شکار کر کے کھاتے ہیں۔ حیران کن امر ہے کہ شاہین یا فالکن کا ایک علیحدہ خاندان (Falco) ہے اور الو بھی ایک الگ خاندان کا پرندہ ہے۔ ذیل کے اشعار میں ان شاہین صفت پرندوں کی ان خوبیوں کا ذکر ہے جو اقبالؒ کی نظر میں پسندیدہ ہیں: -

1- مردار سے گریز

پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا
نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے
شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

2- شہپری

شہپر زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

.....

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخوردہ
اے تیرے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں

3- قوت و شوکت پرواز

دراج کی پرواز میں ہے شوکت شاہیں
حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ دراج

یہ حسن و لطافت کیوں؟ وہ قوت و شوکت کیوں
بلبل چمنستانی، شہباز بیابانی!

4- تجسس

چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش افرنگ

5- نگاہ کی بے باکی

یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تری آنکھوں میں بے باکی نہیں ہے

6- سرتاپا نظر، دور بینی، تیز نگاہی

لیکن اے شہباز یہ مرغانِ صحرا کے اچھوت☆
ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر

ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام
روح ہے جس کی دم پرواز سرتا پا نظر

7- ہمت، قوت بازو اور بلند پروازی

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

.....

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

.....

میان شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی

8- شکار پر جھپٹ پڑنے کی جبلت / اصلاحیت

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

.....

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

☆ (چیل، کوے اور گدھ وغیرہ)

9- آشیاں بندی سے گریز
گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

.....

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

.....

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

10- بے جگری، بے باکی
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

11- علائق دنیا سے لاتعلقی، زہد، خلوت پسندی
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

.....

بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

.....

مندرجہ بالا اشعار میں علامہ اقبال نے شاہین اور عقاب کے تمام پسندیدہ خصائل کا ذکر کر دیا ہے جن کے باعث وہ دیگر پرندوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ قرونِ وسطیٰ کی عظیم رومن ایمپائر کا امتیازی نشان بھی عقاب ہی تھا۔ جرمنی کا قومی نشان ہٹلر سے پہلے بھی عقاب تھا اور ہٹلر کے عہد میں بھی عقاب ہی رہا۔ عصرِ حاضر میں امریکہ کا قومی پرندہ بھی عقاب ہی ہے۔ امریکہ کی سرکاری مہر پر بھی عقاب کا نقش کندہ ہے اور متحدہ عرب امارات کا قومی نشان بھی عقاب ہے۔ اس موقع پر علامہ اقبال کو ان کی مستقبل بینی پر داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ انہیں اس خدشے کا بھی ادراک تھا کہ مستقبل میں شاہین کی عادات و خصائل سے لاعلم کوئی شخص کہیں الو کو شاہین نہ قرار دے ڈالے، فرماتے ہیں:-

معلوم نہیں ہے یہ حقیقت کہ خوشامد
کہہ دے کوئی الو کو اگر رات کا شہباز

.....

امید ہے کہ قارئین کرام بخوبی جان چکے ہوں گے کہ الو اور شاہین میں فرق محض اقبالؒ کی شاعری ہی کا نہیں درحقیقت یہ فرق شاہین کو قدرت کے عطا کردہ ان خصائل اور اوصاف کے باعث ہے جو مردار خور گدھ اور موش خور الو پر شاہین کی برتری اور فضیلت کا موجب ہیں۔

اور آخر میں اقبال ہی کا ایک قطعہ:

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتے پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

I do not reckon that knowledge and wisdom worth a blade of grass.
That alienates the Muslim warrior from sword and spear.
If you possess a drop of blood and handful of feathers.
Come and I shall teach you how to live the life of a falcon.

☆☆☆☆☆

ن۔م۔راشد کی نظم گوئی: افکار و تصورات کے عیاں اور مخفی پہلوؤں کی بازیافت [حصہ اول]

Poesy of N. M. Rashid: Resumption of Conspicuous and Obscure Aspects of Thoughts and Notions

Abstract

N. M. Rashid (1910-1975) is decidedly a seminal name in the annals of Urdu poetry, particularly the poetry that has been written in Pakistan. Rashid was a very well-read man, that much is established and well known. It is also manifest that Rashid Sahib was a multi-dimensional poet. He was at one and the same time was well versed in whatever the modern world had to offer, it's achievements as well as its predicaments. Rashid simultaneously was also grounded in the past; the past of myth and legend, the past that remained with him all through his voyage of life. Economics, sociology, religion (read and treated in its entirety of experience rather than a mere amalgam of the pedantic), politics and its varied dimensions, all were there in his consciousness and in turn found reflection in his poetry. It is extraordinary yet a fact that N. M. Rashid was in essence a highly spiritually inclined individual. All through his life he remained consumed by his passion for finding the elixir of life and that elixir was taken not to prolong his lifespan, but to get nearer to the Divine. The metaphysical aspect of his poetry was perhaps overlooked by critics. In this study, the present scribe has endeavoured to look deeply into this rather overlooked aspect in the cover of criticism on Rashid. Moreover, Rashid Sahib had dug deep in the apple of life; he was an international bureaucrat and, in

that capacity, examined how the post-colonial world was sought to be shaped by erstwhile Colonial powers even after direct control of the colonized countries had to be relinquished due to exigencies of circumstances. All these observations and experiences gained by this great poet, manifested themselves in his poetry. The variety of themes, the difference of approach and the propensity to look at the world with fresh eyes, have all been sought to be studied here.

N. M. Rashid is a seminal name in the annals of Urdu poetry. Being a multi-dimensional poet, he was well versed in whatever the modern world had to offer, it's achievements as well as its predicaments. Rashid was also grounded in the past of myth and legend; that remained with him all through his life. His poetry reflects various economic, sociological, religious (entirety of experience rather than a mere amalgam of the pedantic), political and other dimensions. The metaphysical aspect of his poetry was perhaps overlooked by the critics. In this study, the resumption of conspicuous and obscure aspects of thoughts and notions from Rashid's poesy has been taken into consideration with special reference to his books Mavra (1941), Iran Mein Ajnabi (1955), La = Insan (1972) and Guman Ka Mumkin (1976/Posthumously published). Cultural touch is predominant in his poetry. Rashid's prose especially critical essays and letters also have historical, literal and cultural sense in addition to his marvelous poetry. Rashid as a part of bureaucracy; analyzed the post-colonial world and his poetry represents such kind of issues. These debates and variety of themes, the difference of approach and the propensity to look at the world with fresh eyes, have all been sought to be studied here.

Keywords: Cultural logic, myth, eternity, metaphysical, new man, rejection crisis, new world order, resumption, love as human value, conspicuous, obscure.

ن م راشد (1910ء۔ 1975ء) جدید اُردو شاعری کی تاریخ میں اپنے موضوعات، تکنیک، فکری حوالے سے اور زبان و بیان پر دسترس کے حوالے سے اور اپنی کرافٹ کے اعتبار سے ایک اہم نام ہے۔ اپنے افکار کے حوالے سے ن۔م۔راشد ایک کثیر الجہتی شاعر ہونے کے ناطے، وہ جدید دنیا کی پیش کشوں اور کامیابیوں کے ساتھ ساتھ اس کی مشکلات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ راشد کے یہاں ماضی اور اساطیری عناصر کے واضح آثار ملتے ہیں، جو زندگی بھر ان کے ساتھ رہے۔ ان کی نظمیں مختلف معاشی، سماجی، مذہبی (صرف مخصوص تصورات کے امتزاج کے بجائے تجربات)، سیاسی حوالے سے اور دیگر جہات کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی نظموں کے مابعد الطبیعیاتی پہلو کو نقادوں نے نظر انداز کیا ہے۔ اس مقالے میں راشد کے افکار و نظریات کے عیاں اور مخفی پہلوؤں کی بازیافت کو ان کی کتابوں ''ماورا'' (1941ء)، ''ایران میں اجنبی'' (1955ء)، ''لا = انسان'' (1972ء) اور ''گماں کا ممکن'' (1976ء/ بعد از مرگ شائع ہوئی) کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ ثقافتی لمس ان کی شاعری کا غالب عنصر ہے۔ شاعری کے علاوہ راشد کی نثر بالخصوص اُن کے تنقیدی مضامین اور خطوط میں بھی تاریخی، ادبی اور ثقافتی پہلو ملتے ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں ن۔م۔راشد بیوروکریسی کا حصہ بھی رہے اور اُنھوں نے نوآبادیاتی دور کے جکڑ بند کو بھی اپنے انداز سے اپنی تخلیقات کا سرنامہ بنایا۔ ظاہر ہے کہ یہ اُن کا کئی ایک حوالوں سے تخصص بھی ہے اور ان کی شاعری اس قسم کے مسائل کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ یہ بحثیں اور مختلف موضوعات، نقطۂ نظر کا فرق اور دنیا کو نئے زاویۂ نظر سے دیکھنے کا رجحان، ان سب کا یہاں مطالعہ کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: ثقافتی منطقے، اساطیر، ازل اور ابد کا معاملہ، مابعد الطبیعیاتی صورت حال، نیا آدمی، مسترد ہونے کا خوف، نیا عالمی نظام، بازیافت، عشق ایک مستقل انسانی قدر، عیاں اور مخفی بیسویں صدی کی جدید اُردو نظم کا حوالہ ن۔م۔راشد (نذر محمد راشد) کے بنا ادھورا رہتا ہے۔ راشد کا جنم فضل الٰہی چشتی کے ہاں یکم اگست 1910ء کو اکال گڑھ، گوجرانوالہ میں ہوا۔ اُنھوں نے گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ سے میٹرک (1926ء)، گورنمنٹ کالج لائل پور سے ایف اے (1928ء)، گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے (1930ء) اور ایم اے اکنامکس (1932ء) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ راشد کی پہلی شادی 1935ء میں اُن کے ماموں کی بیٹی ''صفیہ'' سے ہوئی، جن کی 1959ء میں وفات ہوئی۔

پہلی شادی سے راشد کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے 1961ء میں راشد نے لندن میں شیلا (شیلا انجلینی / شیلا راشد) سے دوسری شادی کی۔ دوسری شادی سے اُن کا ایک بیٹا ہے۔ وہ مختلف رسائل و جرائد کے مدیر رہے، جن میں فیصل آباد سے جاری ہونے والے ''بیکن''، لاہور سے ''راوی'' اور ''نخلستان'' جب کہ ملتان سے نکلنے والے ''شاہ کار'' جیسے نام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ریڈیو پاکستان کے رسالے Pakistan Calling کے بھی مدیر رہے۔ ملازمت کے سلسلہ میں راشد آل انڈیا ریڈیو، انٹر سروسز پبلک ریلیشنز، ریڈیو پاکستان اور اقوام متحدہ کے ساتھ مختلف حیثیات سے وابستہ رہے۔ دورانِ حیات اُن کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے، جن میں پہلا شعری مجموعہ ''ماورا'' (1941ء)، دوسرا شعری مجموعہ ''ایران میں اجنبی'' (1955ء) اور تیسرا شعری مجموعہ'' لا = انسان'' (1969ء) شامل ہیں، جب کہ ایک مجموعہ ''گماں کا ممکن'' (1976ء) اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ راشد کے خطوط نسیم عباس احمر نے ''ن م راشد کے خطوط'' (2008ء) کے عنوان سے 2008ء میں ترتیب دیے، جب کہ اُن کے مضامین کو شیما مجید نے ''مقالاتِ راشد'' (2002ء) کے عنوان سے ترتیب دیا۔ راشد کا انتقال بوجہ ہارٹ اٹیک 19 / اکتوبر 1975ء کو لندن میں ہوا۔ اُن کی یاد میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے ایک ہال کا نام ''ن م راشد ہال'' رکھا گیا ہے۔ راشد کی نظموں کے علاوہ اُن کے مضامین اور خطوط بھی مخصوص علمیت، ادبیت اور تہذیبی و ثقافتی پہلو رکھتے ہیں۔

ایک اہم شاعر اگر پتھر کو چھو دے تو اُس میں بھی چمک اور لپک آ جاتی ہے۔ جدید اُردو نظم میں جدید شعرا نے اضافے کیے ہیں اور ندرت سے بھی کام لیا ہے۔ ن م راشد کی نظمیں بظاہر اپنی معروفیت اور معروضیت میں نسبتاً چھوٹی نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔ اُن کے اپنے قد، کاٹھ کے اعتبار سے، لیکن اِن نظموں کی قرأت سے ہم پر کُھلتا ہے کہ یہ نظمیں بھی ہر چند کہ اتنی مقبول اور معروف نہیں ہیں۔ اِن کے جو موضوعات ہیں، وہ اتنے زیادہ بسیط نہیں ہیں، جتنے ان بڑے شاعروں کی معروف نظموں کے ہیں۔ اس کے باوجود یہ نظمیں اپنے اندر وہ کیفیت، شعری وفور، تہذیبی احساس اور خاص طرح کی زندگی کا رنگ سموئے ہوئے نظر آتی ہیں۔ ن م راشد کی ایسی ہی ایک نظم ''طلسمِ جاوداں'' اُن کے پہلے شعری مجموعہ ''ماورا'' میں شامل ہے۔ ''طلسمِ جاوداں'' کا مخاطبہ اور کلامیہ شاعر کی محبوبہ ہے اور اس کے بطن میں محبوبہ کے لمس اور محبوبہ سے وصال کی خواہش بلکورے لے رہی ہے۔ اگر محض اتنی سی بات ہوتی تو یہ نظم ہماری توجہ کا مرکز نہ

ٹھہرتی، چوں کہ یہ تو دُنیا کی شاعری کے مرغوب و محبوب موضوعات ہیں۔ اِس میں اہم بات ن م راشد نے اپنے شعری وژن اور اپنی رفعتِ خیال کے وسیلے سے کی ہے۔ اسے شعری پیکر میں سمویا اور منقلب کیا ہے۔ راشد نے اپنی نظری و شعری رفعت اور پیڈسٹل سے اِس نظم میں ایک خاص بات اور تاثیر پیدا کی ہے۔ یہاں پر "مَن و تُو" سے اُوپر اُٹھ کر محبّ اور محبوب کی کیفیات کو اُنھوں نے تہذیبی اور ثقافتی منطقے، اساطیری منطقے اور زندگی کے ایک بڑے کُرے کی طرف پھیلا دیا ہے، جسے وہ اپنے مخصوص تخلیقی پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی محبوبہ کی جمال آفرینی پر قلم اُٹھاتے ہیں اور اُس کی آنکھوں کے طلسم کو "طلسمِ جاوداں" سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ طلسم اتنا جامع اور ہمہ گیر (گہرائی و گیرائی اور حالات، جہت، شیڈز) ہے اور اتنا ہمہ وقت ہے کہ شاعر اُس طلسم کو لمحۂ موجود سے اُوپر اُٹھا کے کئی صدیوں سے پیہم زندگی عطا کرتا ہے۔ وہ کئی صدیوں سے زندہ ہے اور انتہائے وقت تک پایندہ ہے۔ وقت ایک ایسی اکائی ہے، جس کی ابتدا اور انتہا کے متعلق محض اندازے ہی لگائے جا سکتے ہیں۔ عمومی طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وقت کی انتہا اور وقت کی ابتدا ایک ازل و ابد کا معاملہ ہے۔ محبوبہ کی آنکھوں کے طلسم کو شاعر ازل و ابد کے سلسلے اور قصے کے ساتھ منطبق کرتا ہے۔ یعنی وہ دائم اور قائم رہنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں شاعرانہ غلو تو ہے، لیکن شاعر کا شعری وفور اور اُس کی جو اپنی محبوبہ کے بارے میں وارفتگی ہے، وہ بھی اِس سے ظاہر ہوتی ہے۔ پھر اِس سے آگے وہ تاریخ میں سفر کرتے ہیں۔ وہ تخیل کی سطح پر کلچرل انتھروپولوجی میں سفر کرتے ہیں۔ آگے کے مصرعوں میں وہ چیز محض لمحۂ موجود سے اُوپر اُٹھ کے اور محض محبوبہ کی آنکھوں کی جو طلسم زدگی ہے، اُس سے اُوپر اُٹھ کر، شاعر ایک بہت بڑی اُپج پر اپنے قاری کو لے جا رہا ہے۔ شاعر اپنے قاری کو بھی اُسی نظری و فکری اوج کمال تک لے جانا چاہتا ہے، جہاں سے وہ خود تمام منظر کا شاہد ہے۔ ملاحظہ ہو:

رہنے دے اب کھو نہیں باتوں میں وقت/
اب رہنے دے/ اپنی آنکھوں کے طلسمِ جاوداں میں بہنے دے/ تیری آنکھوں میں ہے وہ سحرِ عظیم/ جو کئی صدیوں سے پیہم زندہ ہے/ انتہائے وقت تک پایندہ ہے/ دیکھتی ہے جب کبھی آنکھیں اٹھا کر تو مجھے/ قافلہ بن کر گزرتے ہیں نگہ کے سامنے/ مصر و ہند و نجد و ایراں کے اساطیرِ قدیم/ کوئی شہنشاہ تاج و تخت لٹواتا ہوا/ دشت و صحرا میں کوئی شہزادہ آوارہ کہیں/ سر کوئی جاں باز کہساروں سے ٹکراتا ہوا/ اپنی محبوبہ کی خاطر جان سے جاتا ہوا (۱)

اِن مصرعوں میں عشق کی ایک لازوالیت ہے کہ تنہا میں ہی محبت میں مبتلا و گرفتار نہیں

ہوں۔ ایک خاص کیفیت ہے کہ تنہا میں ہی اسیرِ محبت نہیں ہوں، بلکہ ایران، ہند، نجد، مصر کہ جب ہم اوراقِ تاریخ کو دیکھتے ہیں، تو وہاں پر شہنشاہوں سے لے کر شہزادوں تک اور جانبازوں تک سبھی کے سبھی جو ہیں، وہ رہِ عشق میں جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ میر کے نزدیک یہ وہی معاملہ ہے کہ سب اُسی زلف کے اسیر ہوئے (2) کیٹس بھی اپنی شہرۂ آفاق نظم "لا بیلے ڈیم سینز مرسی" میں اِسی جانب اشارہ کرتا ہے کہ محبت کے سبھی ستائے ہوئے ہیں۔ عشق اگرچہ انفرادی واقعہ ہے، مگر انسان کا جو اجتماعی ضمیر ہے، یہ اُس کی بھی شہادت ہے۔ راشد لمحۂ موجود سے اُٹھ کر انسانی تہذیب و ثقافت، مختلف زمانوں کے تمدنوں اور طرزِ زندگی کو کھنگالتے ہیں۔ وہاں بھی اُنھیں اگر کوئی دائمی و لازوال روایت اور مسلسل انسانی صورتِ حال کا سُراغ ملتا ہے، تو وہ روایت فقط محبت کی روایت ہے۔ محبت کی وہ روایت ایسی جاں گسل ہے کہ اُس کے لیے شہنشاہوں نے تخت لٹوائے ہیں، شہزادوں نے آوارگیاں کی ہیں، صحرا نوردیاں کی ہیں، کوہساروں سے سر بھی ٹکرائے ہیں۔ یہاں تک کہ جان سے بھی گئے ہیں۔ یہ جو عشق کا جان لیوا ہونا ہے، یہ ایک مستقل انسانی رویہ اور قدر ہے۔ اس بڑی عالمی روایت اور مستقل انسانی قدر کا شاعر خود بھی حصہ بنتا ہے، جب وہ اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوتا ہے۔ پھر یادوں کی ایک لہر ہے، ایک چراغاں ہے، جو شاعر کے دل و دماغ میں مرتسم ہے۔ راشد نے محبت کرنے والوں کے بارے میں کہا ہے:

آج میں ہوں چند لمحوں کے لیے تیرے قریب/ سارے انسانوں سے بڑھ کر خوش نصیب/ چند لمحوں کے لیے آزاد ہوں تیرے دل سے اخذِ نور و نفخہ کرنے کے لیے/ زندگی کی لذتوں سے سینہ بھرنے کے لیے/ تیرے پیکر میں جو روحِ زیست ہے شعلہ فشاں وہ دھڑکتی ہے مقام و وقت کی راہوں سے دُور بیگانہ مرگ و خزاں (3)

اب یہاں آ کر شاعر اپنے اُس لمحاتی حظ جو اُسے محبوبہ کی قُربت سے حاصل ہو سکتا ہے، اُس کی طرف پلٹ آتا ہے کہ وہ ساری باتیں ٹھیک ہیں، وہ میرے علم میں ہے کہ عشقِ لازوال نے انسانی تاریخ میں انسانی تہذیب پر کیا کیا لازوال نقش مرتسم کیے ہیں۔ مگر اِن باتوں میں کیا رکھا ہے اور یہ جو لمحۂ موجود ہے، جس لمحے میں تم میرے قریب ہو، اِس لمحے کو ہمیں کھونا نہیں چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایک عاشق اُس لمحے میں خود کو ساری دُنیا کے انسانوں سے بڑھ کر خوش قسمت اور آزاد و خود مختار گردانتا ہے۔ وہ لمحۂ موجود میں اپنے محبوب سے فیض یاب ہونا چاہتا ہے۔ یہاں محبت کی مابعد الطبیعیاتی صورتِ حال ایک ایسی تصویر بناتی ہے، جو عشقِ لازوال پر دال ہے اور

پھر محبت کی یہ وہ جہت ہے جو کائناتی کُرے کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راشد کے ہاں رومانی معاملات اپنی سطح سے بلند نظر آتے ہیں۔ اُن میں فکری پختگی اور تخیل کی گہرائی کے آثار بھی نمایاں ملتے ہیں۔ فیض کے نزدیک اُن کی شاعری میں عام رومانی شاعروں کی نسبت دیانت، وسعت، تنوع اور گہرائی کہیں زیادہ ہے۔ (4) اب یہاں شاعر کی جبلّی خواہشِ وصل اپنے قاری کی اُنگلی پکڑ کر اُس کو تہذیبوں کے مدار میں لے جاتی ہے۔ وہاں عشق ایک لازوال اور مستقل قائم بالذات قدر کے طور پر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعر گوشت پوست کا ایک شخص اور انسان بھی ہے، وہ جہاں ایک گہرا تہذیبی شعور رکھتا ہے اور عشق کی روایت سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہے، وہیں وہ اپنے جذبات کے بھی تابع ہے یا اپنے جذبات سے مُکر نہیں سکتا۔ وہ اپنے جذبات کی بھی تشفی چاہتا ہے، تو شاعر اپنی محبوبہ کو بجُست (تجویز) کرتا ہے کہ وہ ساری باتیں ٹھیک ہیں، تمھارے بھی علم میں ہیں، میرے بھی علم ہیں، لیکن ہمیں اِس لمحے (لمحہ موجود) کو کھونا نہیں چاہیے۔ اُن باتوں میں فی الوقت نہیں جانا چاہیے، جو گزری ہوئی باتیں ہیں۔ وہ انسانی تمدن اور گزشتہ کا حصہ ہیں۔ ہمیں اِس لمحے کو پوری طرح متمول اور ثروت مند کرنا چاہیے۔ میں کیا چاہتا ہوں! شاعر اپنی محبوبہ کے حُسن سے نُور و نغمہ اخذ کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے توسط سے زندگی کی جو نعمتیں ہیں اور زندگی کی جو لذتیں ہیں، اُن سے سینہ بھرنا چاہتا ہے۔

ن م راشد کی زیرِ نظر نظم میں محبت کا مابعد الطبیعیاتی عنصر اپنی تمام تر رفعت کے ساتھ موجود ہے، جو اُن کی شاعری کو محبت اور عشق کے سیاق و تناظر میں آفاقی جہت سے ہم کنار کرتا ہے۔ یہ عنصر اُن کی شاعری کو بدنی محبت سے ماورا سطح عطا کر کے خیال و امکان کی نئی وسعتوں میں لے جاتا ہے۔ اُس کے محبوب کا ایک لمحاتی پیکر ہے۔ اُس کے محبوب کا ایک وُجودی پیکر ہے۔ مگر اُس وُجودی پیکر کے اندر جو طلسم، حُسن کاری اور زندگی کی جو دہکتی اور صیقل شعلگی ہے، وہ زمان و مکاں سے بلند و بالا ہے۔ وہ حُسن کاری شاعر کے مطابق مقام و وقت کی راہوں سے ماورا ہے، یعنی وہ لمحاتی نہیں ہے۔ وہ لمحہ موجود یقیناً ہے، جس میں وہ دونوں اکٹھے ہیں۔ شاعر اپنی محبوبہ کے حُسن سے نور و نغمہ اخذ کرنا چاہتا ہے، لیکن اب محبوبہ کے حُسن کی تحریک کرتے ہوئے، شاعر یہ کہتا ہے کہ تمھارا حُسن جو ہے، اور یہ جو لمحہ ہے، یہ لمحہ فنا ہو جانے والا ہے۔ یہ لمحہ عارضی ہے، لیکن تمھارا حُسن اور تمھارے کلبوت کے اندر جو دھڑکتی ہوئی زندگی ہے، وہ دائمی ہے۔ وہ مقام اور وقت یعنی زمان و مکاں کے تعین سے ماورا ہے، اور ''بیگانۂ مرگ و خزاں'' بھی ہے۔ یعنی اُس کو

مرگ و خزاں کا کوئی دھڑکا نہیں ہے۔ تمھارے حُسن اور روح میں اتنی ابدیت ہے کہ گُزرتے وقت کی چاپ جو ہے اور موسموں کا جو تغیر و تبدل ہے، وہ اُس پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ یہ حُسن ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ "بیگانہ مرگ و خزاں" ہے۔ اب اس مقام پر شاعر حُسنِ بدنی وُجودی کو حُسنِ ازلی کے ساتھ جوڑ دیتا ہے اور اُسے صفتِ ابدی سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ یہ وہ حُسن ہے، جو زمان و مکاں کا محتاج نہیں ہے۔ یہاں حُسن کی تحریک وسپاس کرتے ہوئے، شاعر انسانی حُسن کو اُس کے بدن کے مدار سے نکال کے حقیقتِ ازلی و ابدی کے مدار میں داخل کر دیتا ہے۔ وہ اُسے ایک ابدیت و دائمیت عطا کرتا ہے کہ یہ حُسن اپنے تسلسل میں ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ اُسی حُسن کا ایک کوندہ تم ہو! وہی حُسن جو حُسنِ ازلی ہے، آگے کے مصرعے، شاعر کے اسی موقف کی تائید و توثیق اور وضاحت کے لیے ہیں:

ایک دن جب تیرا پیکر خاک میں مل جائے گا/ زندہ، تابندہ رہے گی اُس کی گرمی اُس کا نُور/ اپنے عہدِ رفتہ کے جاں سوز نغمے گائے گی/ اور انسانوں کو دیوانہ بناتی جائے گی/ رہنے دے اب کھوکھلی باتوں میں وقت اب رہنے دے/ وقت کے اس مختصر لمحے کو دیکھ/ تُو اگر چاہے تو یہ بھی جاوداں ہو جائے گا / پھیل کر خود بیکراں ہو جائے گا (5)

خاک میں ملنا" "فنا" کا استعارہ ہے، لیکن خاک میں وُجود مل جائے گا، اُس کا حُسن اور اُس کے حُسن کا طلسم اور اُس کی تاب کاری جو ہے، وہ مرنے والی چیز نہیں ہے۔ یہاں شاعر محبوبہ کے حُسن کو اُس کے بدن کی محدودات سے نکال کر ایک ماورائی کیفیت سے ہم کنار کرتا ہے۔ یہاں پر آ کر پھر راشد نے اس کو جوڑ دیا گیا ہے کہ بدن اور وُجود جو ہے، وہ یہاں بے معنی ہو گیا ہے۔ وُجود کے اندر پوشیدہ ایک روحِ اضطرار اور روحِ انبساط جو ہے، وہ دائمی ہے، اُس کو موت نہیں آئے گی۔ جب تمھارا بدن خاک میں مل کر خاک ہو جائے گا، اس کے باوجود تمھارے حُسن کی ریزہ کاری جو ہے، وہ انسانوں کو نغمے سُناتی رہے گی۔ وہ زندگی کی گرمی اور زندگی کا نور زمانوں اور قرنوں تک تقسیم کرتی رہے گی اور وہ زندہ و تابندہ رہے گی۔ سلیم احمد کے نزدیک راشد کی نظم نے پہلے تو رومانی انسان کی نفی کی اور اُس کے نچلے دھڑ کو اوپر کے دھڑ سے جوڑ کر پورا آدمی بنا دیا اور جب یہ آدمی مکمل ہو گیا تو اُس نے اپنی محبوبہ کو بھی مکمل کر لیا۔ (6) یہ استقرار کرنے کے بعد شاعر پھر پلٹتا ہے، اُس لمحے کی طرف جس لمحے میں وہ دونوں مقید ہیں، جس میں وہ اپنے خالص انسانی جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

یہ ایسا لمحہ ہے، جس کے بارے میں شاعر کو یقین ہے کہ یہ فانی ہے اور اس لمحے نے گور

جانا ہے۔ مگر اس لمحے میں ابدیت ڈالنے یا شامل کرنے کا اِدعا جو ہے، وہ اپنے محبوب سے اُس کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ لمحہ جو عارضی ہے۔ یہ لمحہ گُوراں ہے۔ تُو اگر چاہے تو اِس لمحے کو ابدیت سے ہم کنار کر سکتا ہے۔ تیری سخاوت، آمادگی اور فیاضی کے نتیجے میں جب یہ لمحہ جو وقت کے ایک موہوم سے نقطے پر رُکا ہوا ہے، یہ لمحہ تیری آمادگی اور سخاوت سے اور تیرے لمس کی سخاوت اور فیاضی سے یہ لمحہ پھیل کر بیکراں ہو جائے گا۔ زمان و مکاں سے بے نیاز ہو جائے گا اور ابدیت حاصل کر لے گا۔ پھر یہاں محبوب کا جو طرزِ عمل ہے، اُس کے متعلق کہتا ہے کہ تم جو مجھے باتیں کر رہے ہو، اے میرے محبوب! اِن سے اطمینان نہیں ہو سکتا، یہ باتیں ٹالنے والی ہیں۔ اِس میں جو ابدیت ہے، جسے میں تمھاری سخاوت، تمھارے کرم اور تمھارے جُود و سخا کے باعث قائم کرنا چاہتا ہوں، تمھارا گُریز اُس کے رستے میں حائل اور حارج ہے۔ چناں چہ تم اپنے گُریز کی باتوں کو رہنے دو اور میرے جذبات کی ترنگ اور نشے کو دیکھو۔ میرے جذبات میں اتنا تحرک، تموج، تاثیر اور اتنی قوت ہے کہ اُس نے تیرے سینے میں بھی ایک ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔ شاعر ایک محبت کی گرمی، اس کے نور میں پگھلنا اور نہانا چاہتا ہے۔ یہاں وہ اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ اپنے آپ کو اپنے گُریز کے باعث اُس سرشاری سے کیوں محروم رکھنا چاہتے ہو! راشد اپنے محبوب کو تجویز (سجیشن) کرتا ہے کہ وہ اسے زندگی کی لذتوں سے سینہ بھر لینے دے اور اس کو اپنی روح کی تکمیل کر لینے دے۔ وصال کی ایک سطح بدنی اور لمحاتی ہے، جس کا تعلق جنسی عمل اور جنسی خواہش کی تکمیل سے ہے، لیکن وصال ایک ارفع ترین سطح کے اُوپر زمان و مکاں سے آزاد بھی ہو جاتا ہے۔ وہاں پر وصال محض بدنی خواہشات کی تکمیل کا آلہ نہیں بنتا بلکہ وہ روح کی تکمیل کے جو تقاضے ہیں، اُن کی بھی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ راشد کی شاعری میں رومانویت اور اُن کے گہرے مطالعے کے تناظر میں بات کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد فخرالحق نوری رقم طراز ہیں:

''شاعری کے روایتی دائرے سے باہر نکلنے اور یک سطحی رومانویت سے آگے بڑھ جانے کا ایک اہم سبب وہ ذہنی تربیت بھی ہے، جو جدید علوم کی مرہونِ منت ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وسعتِ مطالعہ کے سبب راشد کی شاعری فکر و دانش کی نئی نئی دنیاؤں سے آشنا ہوتی چلی گئی۔'' (7)

یہاں بدن اور روح کا جو ایک تضاد ہے، شاعر اپنے اس وفورِ خواہش سے اُس تضاد کو بھی زمان و مکاں سے ماورا کر دیتا ہے کہ وصل کی ایک صلاحیت تو لمحاتی نشاط ہے، لیکن ایک بڑے پیمانے پر یہ روح کی سیرابی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔ شاعر اپنے

محبوب اور اس کے قُرب کے ذریعے، نشاطِ روح و بدن دونوں چاہتا ہے۔ یہی وہ مرکزہ ہے، جہاں آ کر وقت بے معنی ہو جاتا ہے اور ابدی کیفیتیں جو وصل کی سرشاری سے پیدا ہوتی ہیں، وہ انسان کی جوازلی کشاکش ہے۔ زمانوں کا ازلی چلن، روحِ قدیم اور ابدی سچائیاں، وصل کی لمحاتی کیفیت جو ہے، اگر اُس میں روح اور بدن کی یک جائی ہو جائے، تو ان میں ابدیت کا طلسم پیدا کرنے کی صلاحیت وافر مقدار میں موجود ہے۔ یہ محبت کی مابعد الطبیعیاتی کیفیت اور سطح ہے، جو بدنی و جسمانی مقام سے انسان کو بلند کر کے کائناتی اور لازوال محبت سے ہم کنار کرتی ہے اور محبت کو لازوالیت کی قدر پر لا کھڑا کرتی ہے۔ روح کوئی وقتی چیز نہیں ہے، بلکہ روح تو ازلی و ابدی حقیقت اور صداقت ہے۔ یہاں شاعر روح کی سرشاری کے لیے جسمانی محبت کا متقاضی ہے۔

ن م راشد کی نظم ''نیا آدمی'' اُن کے مجموعہ ''گماں کا ممکن'' میں شامل ہے۔ مذکورہ نظم کا انتخاب اِس آرٹیکل میں ایک سے زیادہ وجوہ کی بنا پر کیا گیا ہے۔ یہ نیا آدمی کون ہے؟ اور یہ نیا ادب کیا ہے؟ یہ نئے آدمی کی آگ کیا ہے؟ اور اِس سے مادّی اور روحانی کیا مطالبات اور تقاضے کیا ہیں؟ یہ مطالبات اِس نظم میں تخلیقی پیرائے میں منسوب کیے گئے ہیں؟ یہ نظم ہر اعتبار سے ن م راشد کی اُن نظموں میں شمار کی جانی چاہیے، جن میں شاعر کا تہذیبی، تمدنی، ثقافتی اور انسان کے بارے میں جو تیقن ہے، وہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ ن م راشد چوں کہ نہ صرف کثیر المطالعہ تھے، بلکہ اُنھوں نے جدید دُنیا گھوم پھر کر دیکھی بھی ہوئی تھی۔ وہ کئی اعلیٰ مناصب پر فائز بھی رہے۔ اُنھوں نے نئی زندگی اور اُس کے مطالبات کو اُردو کے دیگر شاعروں کی نسبت شاید زیادہ قریب سے محسوس کیا تھا۔ نئی زندگی کے وہ پہلو اور جہات جن کا نوآبادیاتی دور اور مغربی دُنیا سے ایک تعلق رہا، راشد کو اُن کے بطن میں جھانکنے کے مواقع اُردو کے دیگر شعرا کی نسبت زندگی، وقت اور حالات نے زیادہ فراہم کیے۔

[جاری ہے۔]

نبیل احمد نبیل

جاوید احمد سچے احساس و جذبات کا حامل حریت پسند شاعر

میرے خیال میں خوبصورت اور بے مثال شہر کہوٹہ دو وجوہات کی وجہ سے مشہور و معروف ہے ایک کہوٹہ ریسرچ لیبارٹریز جو جوہری توانائی کا ادارہ ہے دوسرا جاوید احمد صاحب۔ جاوید صاحب ایک شخصیت بھی ہیں اور ادارہ بھی۔ دونوں کی وجہ سے پاکستان کا نام اور وقار بلند ہوا ہے۔ کئی اور سیاسی سماجی اور فوجی شخصیات اس علاقہ سے تعلق رکھتی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ معاشرے میں جو اہمیت ایک جینوئن ادیب اور شاعر کی ہوتی ہے کوئی دوسری شخصیت اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ جاوید احمد صاحب کو شاید یاد نہ ہو لیکن میری ان سے چند ملاقاتیں جو مختلف مشاعروں میں ہوئیں لیکن ان سے میری پہلی ملاقات پی ایچ اے لاہور کے مشاعرہ میں ہوئی جہاں یہ مہمان شاعر کے طور پر مدعو تھے اور اپنی باری پر جب انہوں نے کہا کہ:

چند شاعر ہیں جو اس شہر میں مل بیٹھتے ہیں
ورنہ لوگوں میں وہ نفرت ہے کہ دل بیٹھتے ہیں

ان لگاتار اندھیروں میں یہ دو چار چراغ
جیسے کانٹوں میں بھی کچھ پھول تو کھل بیٹھتے ہیں

.....

اس وقت سٹیج پر بیٹھے شعرائے کرام اور پنڈال میں اس کی اتنی پزیرائی ہوئی کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ بار بار یہ شعر سنا گیا اور بے پناہ داد و تحسین سے نوازا گیا۔ ابھی تک کہوٹہ جانے کا اتفاق تو نہیں ہو سکا لیکن ان کی شخصیت کے وقار اور خوبصورتی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کہوٹہ کتنا خوبصورت، زرخیز اور سرسبز ہوگا۔ کسی بھی شاعر کی شاعری کو Avaluecite کرنے کے لیے اس کے ذاتی کردار کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ شاعری میں کردار اور شخصیت کا عکس در آتا ہے اور مضبوط کردار کے حامل لوگوں کی شاعری معاشرتی اور سماجی اقدار کو مضبوط کرتی ہے اور معاشرے میں توازن کا سبب بھی بنتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تہذیبی، ثقافتی اور ارتقائی عمل جاری رہتا ہے۔

کسی بھی شاعر کی ذات اس کی شاعری میں جتنی Involve ہوگی شاعری اُتنی خالص حقیقی اور پُر تاثیر ہوگی اس لیے شاعر کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے اگر دوسروں کے خیالات یا اشعار کے الفاظ کی ترتیب بدل دیں اور عروض سے واقفیت کی بنا پر شعر گھڑ لیں تو وہ چیز تخلیق ہرگز نہیں کہلائے گی۔

فیصل زمان چشتی

تخلیق جواہر، تخلیق وفور، کردار، افکار اور جرأتِ اظہار جہاں اکٹھے ہو جائیں تو ایسے شہکار وجود میں آتے ہیں جنھیں جاوید احمد کی شاعری کہا جاتا ہے:

کنیز شہ کے محل میں سجا کے لائی گئی
دبی ہیں سسکیاں جس کی غلام گردش ہیں
خبر کو بدلا گیا اس لیے مہارت سے
نہ آئیں پردہ نشینوں کے نام گردش میں
ازل سے کارِ جہاں کا ہے اہتمام یہی
خواص مسندِ گل پہ عوام گردش میں

....

قدرت جب کسی کو شاعری ودیعت کرتی ہے تو شاعری کے جملے اوصاف بھی عطا کر کے اس دنیا میں بھیجتی ہے اور وہ خصوصیات شاعر کو عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہیں شاعری کوئی عام وصف نہیں ہے یہ اولیائے کرام کی میراث ہے یہ قابل احترام اور قابلِ فخر چیز ہے مگر آج کے فتنہ گر دور میں کچھ لوگوں کے لالچ، حرص، طمع اور منافقت نے شاعری جیسی مقدس چیز کو بدنام اور برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

آجکل کے دور میں مصنوعی اور حقیقت شاعر کا فرق کرنا اور جاننا بہت ضروری ہو چکا ہے۔ تاکہ جینوئن شاعر کی حق تلفی نہ ہو اور اُسے اس کا جائز مقام مل سکے جاوید احمد ایک نظریاتی شاعر ہیں ان کی شاعری میں معنویت اور مقصدیت اپنے پورے جلال جمال اور کمال کے ساتھ موجود ہے۔ کشمیر ہماری شہ رگ ہے اور ہمارا اٹوٹ انگ ہے۔ اس کی آزادی اس کی سالمیت اور اس کی خودمختاری کے لیے لکھنا بذاتِ خود ایک جہاد ہے یہ جہاد بالقلم ہے یہ کام کوئی مجاہد، اللہ والا، بے باک، نڈر اور حریت پسند شاعر ہی کر سکتا ہے کشمیر کے لیے لکھا ہوا ان کا نوحہ "دنیا کے منصفو، سلامتی کے ضامنو، کشمیر کی جلتی وادی میں، بہتے ہوئے خون کا شور سنو۔"

ایک ایسا اعزاز ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ ان کے لیے توشۂ آخرت بھی ہے ان کے اس نوحے سے کشمیریوں کی بلکتی اور سسکتی ہوئی آواز دنیا کے کونے کونے میں پہنچی ہے اس پر میں ان کو سلام پیش کرتا ہوں۔

میری ایک اور بات یاد رکھیے گا کہ ایسے کاموں کے لیے اللہ پاک اپنے برگزیدہ اور چنیدہ لوگوں کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ بات اختیاری نہیں عطا ہوتی ہے۔

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے
یہ بڑے نصیب کی بات ہے

....

اک سلسلہ ہے جبر کا رنجور دل ہوئے
مقتل سجے تو پھر یہاں منصور دل ہوئے
زخموں پہ آج مرہم کافور دل ہوئے
مے حریت کی پی کے یہ مخمور دل ہوئے
نیلم کی موج موج میں گرداب خون کے

....

جاوید احمد نے شاعری کے منصب کی لاج رکھی ہے اور اس مسند کی حقیقت کو جانا اور پہچانا ہے انھوں نے شاعری کو اپنا مشن سمجھتے ہوئے اپنے کام کو جاری رکھا ہے جو اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ میری نظر میں کم از کم ایسی کوئی کتاب نہیں گزری جو صرف کشمیر کی آزادی کی جدوجہد اور کشمیریوں پر ہونے والے ظلم وستم اور جبر کے خلاف لکھی گئی ہو لیکن جاوید احمد

صاحب نے یہ بھی کر دکھایا ہے اور جہاد بالقلم کا حق ادا کیا ہے۔ ان کا یہ کام ایک ایسا کارنامہ ہے جو تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ میں آج اس مضمون کے توسل سے حکومتِ پاکستان سے مطالبہ کرتا ہوں کہ اس کتاب پر جاوید احمد کی سرکاری سطح پر پزیرائی کی جائے اور ایوارڈ سے نوازا جائے۔

یہ اپنے محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں اور سینہ تان کر کھڑے ہیں۔ جنگ میں سب سے بڑا کام مورال بلند رکھنا ہوتا ہے عزم اور ارادے کی مضبوطی ہوتا ہے۔ نصب العین کے حصول تک جنگ جاری رکھنی ہوتی ہے اور جاوید احمد صاحب کی شاعری نے کشمیریوں کا مورال بلند رکھنے کا فریضہ بطریقِ احسن ادا کیا ہے:

کچھ جو آزادیٔ افکار کی چھب دیکھتے ہیں
بعد اس کے جو ستم اور غضب دیکھتے ہیں
اپنے ہی خون سے کر جاتے ہیں چہرے روشن
ہم شہیدوں میں یہی بات عجب دیکھتے ہیں
درد کی لے ہیں یہ دل ڈوب گئے ہیں لیکن
گونج آزادی کے نغمے کی عجب دیکھتے ہیں

.....

کشمیر جاوید صاحب سے ہے اور جاوید صاحب کشمیر سے ہیں ان کا یہ تعلق قلبی اور روحانی ہے یہ ایسا اٹوٹ رشتہ ہے جو کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ:

زندگی اور زندگی کا امتحان کشمیر ہے
ایسا لگتا ہے زمین و آسماں کشمیر ہے

اس کا نقشہ بن گیا ہے میرے خدوخال میں
آنکھ تو ڈل جھیل ہے میری زبان کشمیر ہے

شاعری انسانی کردار کو بلندی اور افکار کو رفعتیں عطا کرتی ہے۔ شاعری وہ تخت ہے جس پر بیٹھ کر انسان شعور، وجدان، معرفت، حکمت و دانش اور امکانات کی دنیاؤں کا وہ سفر طے کرتا ہے جس کے سامنے دنیا کا لالچ مہدے اور مراعات ایسے لگتے ہیں جیسے کسی بزرگ کو کھلونے سے بہلایا جائے اسی طرح جاوید احمد اپنی شعری سلطنت کے وہ مسند نشین ہیں جنھوں نے اپنے اشعار کی آگہی معرعوں کی جمالیات سے لوگوں کے دلوں میں گھر کیا۔ اور جاوید احمد کی شاعری میں ایک سچا اور سُچا شاعر بولتا نظر آتا ہے ان کے درویشانہ اور قلندرانہ افکار ہمیں ایک خوبصورت زندگی گزارنے اور بہترین معاشرہ ترتیب دینے میں معاون ہیں۔ انھوں نے شاعری کے ذریعے زندگی کے عمیق مشاہدات اور تجربات نئی نسل کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ شاعری میں اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں اور واردات قلبی بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اپنی ذات سے رموز کائنات کا سفر کامیابی سے طے کیا ہے یہی اصل شاعری ہے کیونکہ جب شاعری میں دل بولتا ہے اور سننے والا شاعری کی دھڑکنوں کو سنا لیے گنتا ہے تو جذبات و احساسات کی ترسیل کا کام مکمل ہو جاتا ہے۔

بے رواں موج کا دریا کوئی دریا تو نہیں
جو ہتھیلی پہ رکھی ریت ہے صحرا تو نہیں

یہ نوشتہ ہے ہوس کا تری دیوار نہیں
تو نے اس میں کسی وحشی کو چھپایا تو نہیں

تجھ پہ کھلتا نہیں کیوں بھید کبھی مٹی کا
دل کہیں خاک نشینوں کا دکھایا تو نہیں

جو ترے پاس کوئی ہے بھی سخن کا گوہر
کسی درویش کی گدڑی سے چرایا تو نہیں

.....

جاوید احمد نے اپنی شعری اور فکری بلندی سے ادبی مرکزوں میں ہمیشہ حیران کیے رکھا اور اپنے ہونے کا احساس بار بار دلایا ہے کیونکہ عشق اور مشک کی طرح اچھا شعر چھپایا نہیں جا سکتا۔ اچھا شعر زندہ رہتا ہے وہ سفر کرتا ہے اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے اور یہی دل سے نکلنے والے اور سچے شعر کی طاقت اور معجزہ ہے۔

سماج، معاشرہ، معاشرتی رویے اور احساسات کی نازک پرتیں ان کی شاعری کا خاصا ہیں انھوں نے نسبتاً بڑی بحور کا استعمال کیا ہے لیکن ان میں ردھم اور ترنم ان کی خوبصورتی اور رعنائیوں کو مزید بڑھا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شعر کی طاقت دراصل شعور کی طاقت ہے، جس سے شاعری کی فکری اور شعوری سطح اُجاگر ہوتی ہے۔ جینوئن شاعر ہمیشہ سچ لکھتا ہے اور اُسی کا پرچار بھی کرتا ہے اسی لیے کہتے ہیں کہ:

خامشی کو تو میں گفتار نہیں لکھ سکتا
سو گیا جو اُسے بیدار نہیں لکھ سکتا

شہر میں لوگ کہاں تہمتیں کچھ زندہ ہیں
میں انھیں صاحب کردار نہیں لکھ سکتا

اب اندھیرے کی اجازت سے جو جلتا ہے چراغ
روشنی کا اسے اوتار نہیں لکھ سکتا

جب نہیں لوگوں میں کچھ طاقت و توفیق خرید
میں اسے رونقِ بازار نہیں لکھ سکتا

.....

جاوید احمد صاحب کا فنی و فکری سفر تقریباً چار دہائیوں پر محیط ہے اس تمام عرصہ میں ان کے کلام کا معیار ہمیشہ بلند رہا۔ ان کی شاعری کا ایک ایک مصرع ان کے دل کے نہاں خانوں سے نکلتا ہوا قرطاس پر آتا ہے یہ ایسے گھنے شجرِ سایہ دار کی مانند ہیں جن کی چھاؤں سے ایک زمانہ مستفید ہو رہا ہے یہ دشتِ بے کراں میں ایسے برگد کی طرح ہیں جو خود تو دھوپ برداشت کرتا ہے سختیاں جھیلتا ہے لیکن دوسروں کو ٹھنڈک اور راحت پہنچانے کا سبب بنتا ہے یہ ایسے دریا کی مانند ہیں جو جہاں جہاں سے گزرتا ہے وہاں وہاں کی بنجر اور خشک زمینوں کو سیراب کر کے انھیں سرسبز و شاداب بناتا ہے۔

ان کی ایک ایک موج باعثِ برکت ہے اور پیاسوں کی پیاس بجھا رہی ہے۔ ان کی موجودگی حبس زدہ ماحول میں بادِ صبا کا جھونکا ہے۔ یہ محبت سے رشتوں کو جوڑنے والے ہیں یہ دوریاں ختم کر کے قریب لانے والوں میں سے ہیں ان کا ہمارے درمیان موجود ہونا باعثِ خیر و برکت ہے اللہ پاک ان کی توفیقات میں مزید اضافہ کرے۔ آخر میں ان کے اشعار دیکھیے:

بس اتنی سی مری تقدیر بدلی
کبھی زنداں کبھی زنجیر بدلی

نہ ان آنکھوں نے اپنے خواب بدلے
نہ خوابوں نے کوئی تعبیر بدلی

کسی نے حُسن کے بدلے معانی
کسی نے عشق کی تفسیر بدلی

لہو سے فیصلہ ہم نے لکھا تھا
کہاں جا کر مگر تحریر بدلی

☆☆☆☆☆

حرف وصدا کا سفر

حساس لوگوں سے جہاں آباد ہے اور زیادہ حساسیت رکھنے والوں نے اپنے اردگرد شعر و نثر کا اک جہاں آباد کر رکھا ہے۔ حالات سنگین ہوں اور ان کی سنگینی کو محسوس کرنے والا کوئی شاعر یا ادیب ہو تو، حرف و صدا، کے اک ایسے سفر کی بنا پڑتی ہے جو شاہراہ محسوسات سے گزرتے ہوئے ہنرورانہ حسن کاری کی ایسی منزلوں کا تعین کرتی ہے جہاں احساسات اور جذبات کی آمیزش خوب صورت اشعار کے قرینوں کے در وا کرتی جاتی ہے اور یوں شعر کا خوب صورت پیکر شاعر کی صناعانہ چابکدستی کی ہمراہی سے تراش خراش کے مراحل سر کرنے کے بعد جو قارئین کی نظر اور سامعین کی سماعتوں سے ٹکراتا ہے تو واہ واہ، تحسین و آفرین کی صدائیں گل وگلزار کھلا دیتی ہیں۔ وقت کی گردش میں رب باری سے اپنے حرف وصدا کی سلامتی کے لیے دعا گو نثار ترابی حقیقت میں فضلِ باری سے ایک حوصلہ مند شاعر کے طور پر ابھرا ہے۔

روائتی موضوعات کو جدت کا لبادہ اوڑھا کر اور جدیدیت کو روایت پسندی کی اوڑھنی میں لپیٹ کر جدت وقدامت کا جو حسین امتزاج ''ہر صدا مسافر ہے'' میں پیش کیا گیا ہے۔ منفرد تو ہے ہی ممتاز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی آپ نظیر بھی ہے۔ نثار ترابی کی تخیل پسندی حقیقت پسند تخیل پسندی ہے اسی لیے ان کے موضوعات کی بنیاد ارضی ہے ماورائی نہیں۔

ہر ایک رات کے داماں میں ہے سحر تو یہاں
ہر اک عروج میں شامل زوال رکھا ہے
اور
وہ بھی اترا سا حلوں پر سب جلا کر کشتیاں
ہم نے بھی اب واپسی کے راستے رکھے نہیں

.....

نثار ترابی نے داخلی حُسن اور خارجی زاویے کے پیش کرنے میں کسی سہارے یا پیوندکاری کو ذریعہ نہیں بنایا بلکہ موضوع ان کے باطن سے رونما ہوا، مشاہدے سے اجاگر ہوا - حساسیت نے جذبات کے بحر

راحیلہ خورشید

پرشور میں ارتعاش پیدا کیا، اور فنِ شعر نے دل و دماغ کے دروازوں پر دستک دی، خیال کی پیشکش کے لیے الفاظ دست بستہ حاضر باش ہوئے، اسلوب نے یاوری کی اور فکری وفنی ریاضتوں نے ہمراہی کی تو نثار ترابی کے دل کے آنگن میں موزوں کلام کا شجرگُل وثمر کھلانے لگا۔ اس سارے سفر میں نثار ترابی کا فن جمالیاتی تقاضوں کو نظر انداز کرنے کا قائل نہیں۔ ان کے فن کی مشاطگی ان کے کلام کو جب تک حسن کے زیور سے آراستہ و پیراستہ نہ کر دے تب تک ان کا فنکارانہ ذہن چین نہیں پا سکتا۔ وہ قاری و سامع سے زیادہ خود لطف کی منزلیں سر کر لینا چاہتے ہیں اور یہی بات ان کی کامیابی کی آئینہ دار بھی ہے۔

یہ اب کے بار عجب امتحان میں ڈالا ہے
وہاں رُکا ہوں کہ پانی جہاں نہیں رکتا

.....

نثار ترابی ایک نقاد ہے، زمانے کا نباض ہے، فطرت شناس ہے، فکر وشعور کی بلند تر سطح پر فائز ہے۔ آپ نے زندگی، دنیا، انسان، انسانی رویوں، عمرانی تصورات، سماجیات، معاشرت، مذہب، انسانی نظام فکر اور اسلامی رجحانات کو اپنی تنقیدی نگاہ سے دیکھا ہے۔ موضوعات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کڑے اور با اصول نقاد ہیں اور اسی وجہ سے انہوں نے بغیر کسی لحاظ اور مروت کے جو دیکھا وہ بیان کیا، مگر دلچسپ اور خوب صورت بات یہ ہے کہ شدت جذبات میں طنز کی کاری ضربیں لگانے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ دھیمے مزاج کے معتدل لہجے اور شیریں انداز کے شاعر ہیں۔ تلخ جذبوں کو موضوع بناتے وقت خاص احتیاط کو ملحوظ رکھ کر ایسا اسلوب اور پیرایہ اختیار کرتے ہیں کہ کریہہ موجوعات بھی پُر اثر ہو جاتے ہیں اور ان سے نفور ہونے کے بجائے ہمدردی کے جذبات اجاگر ہوتے ہیں۔ الفاظ کے تیر کمان میں رکھ کر ناپ تول کے بعد ہی نشانے پر لگاتے ہیں۔

پلٹ کے آیا تو تیری طرف ہی آئے گا
وہ ایک تیر جو تیری کماں میں باقی ہے

.....

صدا تو سفر میں رہتی ہے اور سفر کا یہ اشتراک اسے مسافر بنا دیتا ہے۔ آگے بڑھتے رہنا کائنات میں انسانی زندگی کی بقا بھی ہے اور دوامی راز بھی۔ سفر میں رہنا منزل پا لینے سے بہت بہتر ہے کہ اس میں اک حرکت و عمل ہے۔ اک سعی پیہم ہے۔ اک لگن، جستجو، کاوش، جدوجہد اور آگے کا ایک مسلسل عمل ہے۔ اس لیے ''ہر صدا مسافر ہے'' کہانی ہے اک ایسے سفر کی جو کامیابیوں کی منزل کی طرف گامزن ہے اور اگلے--- کی تعبیر بھی۔

کوئی موج کیا ٹھہرے ساحلوں کے پہلو میں
وقت کے سمندر میں ہر صدا مسافر ہے

☆☆☆☆☆

ماضیہ

ہماری گلی ایک اندھی اندھیری گلی تھی

ہماری گلی میں اذانیں سویروں کے ہونے کا اعلان کرتیں

ہمارے مکانوں کے ماتھوں پہ کرنیں اُترنے سے پہلے

دریچوں کی پلکیں جھپکتیں، کواڑوں کے پیچھے چھنکتی ہوئی چوڑیاں

اوڑھنی کو سروں پر سجاتیں کہ

سجدوں کا وقت آ گیا ہے

ہمارے دَروں سے سَروں کے ڈھکے قافلے اک شکستہ سی

مسجد میں صف بند ہو کر خدائے ترحم کا دیدار کرتے

ہماری گلی، بے تہور گلی، دھوپ چڑھنے پہ اونچے مکانوں

کی بوسیدہ پیشانیوں سے ٹپکتی شعاعوں کے قطروں

سے مدّھم اُجالوں کی نم رنگ خیرات پاتی

ہماری گلی، بے تہور گلی، اپنے بیمار بچوں کا میدان بنتی تو نم اور

مدّھم اُجالے اُنہیں گلیاں دیکھ کر ٹل لگانے کی

آسانیاں بخش دیتے

ہماری گلی آج کل اس قدر پُر تہور گلی ہے، منوّر منوّر،

کشادہ کشادہ مگر اب دریچوں کے شیشوں سے سورج کی

کرنیں، دریچوں کے پیچھے پسِ خواب عریاں خیالوں کے

حمام میں ناچتی خواہشوں کے فقط 'مطلع الفجر'

کے جاگ چکنے کی خبریں سنانے پہنچنے لگی ہیں

اُٹھو دوستو! یہ تمناؤں کے رقصِ عریاں کا عرصہ نہیں

بستروں سے نکل آؤ__ اُٹھو

چلو اور دفتر سے اس رقص کے واسطے کچھ توانائی کا تازہ تر

ساز وسامان لائیں'

ہماری گلی کس قدر پُر تجور، معور کشادہ گلی ہے

یہاں اب اذانیں سویرے اُترنے کا اعلان کرنے ہمیں

خواہشوں کے سرابوں کے صحرا کے شر

سے بچانے پہ قادر نہیں ہیں

خالد احمد

میں تیری گود کا پالا

تراخوں چوسنے میں
محو کیسی کیسی جونکیں ہیں

ترے کھیتوں میں بھاری پگڑیوں والے
مسلسل بھوک ہی بونے، اگانے میں لگے ہیں

تیری سرحد کی حفاظت پر
ترے مامور فرزندوں کو
دیتی ہیں دعائیں
ساری بہنیں، بیٹیاں، مائیں
مگر اِس روگ پر سب روئیں، کُرلائیں
کہ وعدے کے کسی مرہم سے بھی
'زخمِ تجاوز' بھر نہیں پاتا
دلوں سے رہزنی کا ڈر نہیں جاتا

ترے قاضی ترازو کو
بس اک 'سی سا' سمجھتے ہیں
بنامِ مصلحت
مکر و ریا کا کھیل کُھل کر کھیلتے ہیں

تیرے سارے بے نوا
صبح و مسا
جو ہر قیامت جھیلتے ہیں
ان کا غصہ بھی
تجھی پر ہی نکلتا ہے

ترے نقار چی ہر آن
خالی اشتعالی شور نشراتے ہیں
دم دم بدشگونی پیٹتے ہیں
گھر میں بیٹھوں کو ہجو ماتے
تماشائی بڑھاتے ہیں

سرِ منبر
زمینی زندگی سے ربط کے
سوکھے ہوئے پتوں کی کھڑ کھڑ ہے

ترے یومِ ولادت پر
طرب آمیز نغموں کی روایت بھی
ترے دانشوروں کو خوش نہیں آتی
ترے اندر اندھیرے ڈھونڈنے کے
اتنے گھاتی ہیں

جلیل عالی

کہ بیرونی کسی سازش کا
ان کو ذکر بھی
زہراب لگتا ہے

ترے چالاک بدخواہوں نے
تیرے خوش نظر اطوار
تیرے بے بدل اثمار کی
تحسین بھی دشوار کر دی ہے

اب ایسے میں تو
تجھ مظلوم کو
معمول سے بڑھ کر محبت کی ضرورت ہے
یہی تو روشنی کے رخ
سفر میں سُرخرو ہونے کی صورت ہے

میں کب اِس نا طلب تیرہ نگاہی
کے فسوں سے ڈرنے والا ہوں
کہ تیری گود کا پالا ہوں
تجھ کو اپنے اور اپنوں کے گرد
اک برکتی ہالہ سمجھتا ہوں
میں تیرے عشق کو
ہر شرط سے بالا سمجھتا ہوں

آگہی

تم نے تو کہا تھا ہر حقیقت
اِک خوابِ ابد ہے در حقیقت

رنگوں کے سراب سے گُزر کر
رعنائیِ خواب سے گُزر کر

نیرنگیِ زیست سب فسانہ
کیا گردشِ وقت، کیا زمانہ

تاروں بھرے آسماں کے نیچے!
کُھلتے نہیں نور کے دَریچے

تاریک ہے زندگی کا رستا
گہرے ہوں ہزار غم کے سائے

چلتے رہو یُونہی چشم بَستہ
اِک یاد کو حرزِ جاں بنائے

لیکن ، یہ حقیقتوں کے پیکر !
پاکوب، برہنہ، دست بر سر

کرتے ہیں نگاہ سے اشارے
کہتے ہیں کہ، ہم بھی ہیں تمھارے

اُڑتی ہُوئی گرد راستوں کی
لائی ہے خبر مُسافروں کی

کیا دیکھیے، کوئی نِکل کے آگے
مسدُود ہر اِک رہِ سفر ہے

ہر ضرب پہ یاں اجل کے آگے
مجبور حیات بے سپر ہے

ٹھہرا ہے کہیں گُزرتا لمحہ
جاگے ہُوئے درد کی صدا پر

ہنستے ہیں دلِ شکستہ پا پر
سمٹے ہُوئے پر خُود آگہی کے

پھیلے ہُوئے کوس زندگی کے
طے کر نہ سکیں گے لوگ جیسے

مُرجھائے ہُوئے چمن کے پھُولو!
بولو ، کہ اجل کا ہاتھ کیسے

شاخوں سے اُتارتا ہے ہم کو
مٹّی میں سنوارتا ہے ہم کو

توصیف تبسم

رقصِ وصال کا وقت ہو گیا ہے [نثری نظم]

اذیت کے ملبے تلے
مَیں ٹوٹے ہُوئے فانوس کی طرح پڑا ہُوں
یہ منظر
جو مفہوم سے کٹ کر گرا ہے
معنویت سے پھر کہاں جُڑ سکے گا
یہ کوئی بادل نہیں
جو سمندر کے سینے سے اُگ آئے
کوئی تارہ نہیں
جو آسمانوں میں پھر سے چمک اُٹھے
دُعا بھی نہیں
جو دوبارہ ہونٹوں پر آجائے
یہ فانوس تو مَیں خود تھا
تُو نے شاید دیکھا نہیں
تری روشنی کے نگر میں
مَیں ٹوٹے ہُوئے فانوس کی طرح پڑا ہُوں
میرا جسم شب کے کفن میں لپٹا ہے
مگر میری آنکھیں
راکھ کے ڈھیر میں بھی چمک رہی ہیں
مَیں چاہتا ہُوں
کہ ابد کے اس آخری کنارے پر ٹھہر کر
ازل کے دریچے میں ایک بار پھر جھانک لُوں
دُکھ کی خاکی گٹھڑی کو سر سے اُتار پھینکوں
تیرے نیلے وعدے کی دستار اوڑھوں
آنکھوں میں کرنوں کا سُرمہ لگاؤں
ستاروں سے آئی ہُوئی روشنی کو لبادہ کروں
اپنی زرد بغل سے
عمر بھر سینت کر رکھا ہُوا سُرخ ہیرا نکالوں
اور تری نذر کے لیے ایک تحفہ بناؤں
مگر اَب سے ہی کہاں ہے!
سفر ختم ہُوا
منزل آن پہنچی
تیری دستک مَیں اپنے دل کے دروازے
پر محسوس کر رہا ہُوں
آسمانوں میں برّاق پروں والی مخلوق
بھاگی پھر رہی ہے
مری آنکھوں کی چھاگلوں میں
بچا ہُوا پانی اُچھلنے لگا ہے
اور مرے پاؤں نیچے کی مٹی
سر پر آنے لگی ہے
شاید رقصِ وصال کا وقت ہو گیا ہے !!

خاور اعجاز

اے مری میز باں!

مرے پاس اِتنی ہی مہلت تھی
جتنی کہ چائے کی چسکی میں آسکتی تھی
میں پیالی کے پیندے میں
اِس آخری گھونٹ کی طرح
کب تک بچا رہتا
اور منتظر رہتا اعلان کا:
دور پورا ہوا
چند لمحوں میں اگلا چلے گا
پھر اگلے سے اگلا
خواتین و حضرات،

اپنی نشستیں نہیں چھوڑیے گا
ذرا پہلوؤں کو بدل لیجیے
مشرقی مغربی، مغربی مشرقی
جیسے بھی بن پڑے
فرش اٹھے اَور چھت کو چھوئے
اپنے اپنے افق، اپنے اپنے عمود
اِک ذرا قابو کر لیجے
بانہوں کے گھیرے میں
جانے نہ پائیں!

میں کب تک کنارہ کٹھالی کا
خالی پیالی کا
دانتوں میں دابے ہوئے
بیٹھ رہتا ترے روبرو
منتظر رہتا احکام کا
میں نے سوچا گرا دوں یہ باقی کی چائے
ترے میز پوشوں کی پھلواریوں پر
اور اعلان سے پہلے ہنگامی یا اِنتقامی
قدم جیسے تیسے اٹھالوں
لنڈھا دوں عجائب کا سیلا، یہ غائب کا گیلا
گِل و گُل پہ، ہر سبزۂ گُل پہ
ہر گرم، ہر سرد کو
اِس روش پر کھلے عام چھوڑوں

تجھے ٹوٹتے برتنوں کے چھناکوں سے توڑوں
مسائل کی مکتی
تراشیدۂ ایکتا
ایکتا کتنا ہلکا ہوا اور کتنا بھاری

یہی سوچ رکھا ہے اور زندگی ڈھل رہی ہے
برابر میں چائے پہ چائے
یونہی چل رہی ہے!!

شاہین عباس

فاعتبروا یا اولی الابصار

جو بدحال بوڑھے کے لب تھرتھرائے
تو رہداریوں میں کھڑے کچھ مؤدب سے
دربان چیخے
"خداوندِ قدوس کا گھر
لٹے شہر کے حزنیے کا سبب ہے"
سو اب شہرِ دل کوز میں بوس کردو
اور اس کے مکینوں میں
جو لوگ تلوار کے وار سے بچ گئے ہوں
انہیں ڈال کے طوق، بابل کی جانب روانہ کرو تم
بچے کھنڈروں پر گدھوں سے
اگر ہل چلاؤ
تو خودرو ببولوں کی مانند
"روشن خیالی" اُگے گی
سو بدحال بوڑھے نے خود ساختہ معجزاتی تصرف سے
شیشہ گریِ ہوا و ہوس کی جو روداد چھیڑی
"خداوندِ قدوس کا گھر
لٹے شہر کے حزنیے کا سبب ہے"
تو چہرے پہ اس کے
ہمہ مقتدر ہستیوں کی جھلک تھی
اور اس کی ہوس ناک آنکھوں میں
پٹرول کے تاجروں سی چمک تھی
اسی لمحے فطرت کی آنکھوں سے آنسو
برنگِ فراواں چھلکنے لگے تھے
سنا ہے وہ "قطرینا" کے ساحلوں تک گئے تھے

محمد افتخار شفیع

یہ جہاں ہے میاں

اُس کو دیکھا تو یاد آ گیا آئنہ

آئنہ جس میں اِک شہر آباد تھا

جس میں آباد تھے کتنے ہی آدمی

اور اِک آدمی میرے جیسا بھی تھا

دِل میں جس کے مچلتے تھے ارماں کئی

اُس کی زنبیل میں کتنے پیمان تھے

کتنی خوشیوں سے دِل اس کا سرشار تھا

آنکھ میں خواب تھے' خواب جھوٹے نہ تھے'

رنگ میلے نہ تھے

اور یقیں موسموں میں نہ تھیں زردیاں

نیلگوں آسماں بھی رسائی میں تھا

آئنے نے سُنا..... کچھ تبسم کیا.....اور ہنس کر کہا

زندگانی تحرک سے بھرپور اِک داستاں

عکس در عکس چلتا ہوا کارواں

یہ جہاں ہے میاں

اسلام عظمی

لاحاصلی کا دکھ

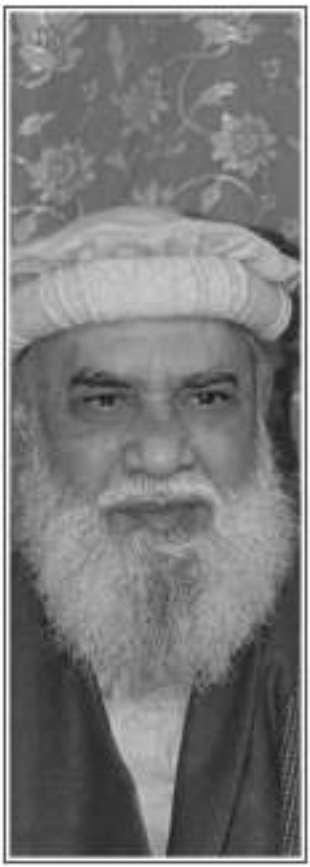

میں فصلِ امید بو رہا تھا
کہ گزرے لمحوں کے تجربوں نے
یہ میرے کانوں میں بات ڈالی
زمین بنجر ہے
اپنی محنت نہ رائیگاں کر
کہ کل کو
لاحاصلی کے دکھ سے تو بچ سکے گا

یہ مشورہ میں نے مان کر
اپنی زندگی کو بچا لیا تھا
مگر یہ دکھ ہے
کہ فصلِ امید بونے والے
تو اپنی فصلیں اٹھا رہے ہیں
میں اپنی لاحاصلی کے دکھ میں
تڑپ رہا ہوں

اکرم ناصر

انتخاب
خالد احمد
نعمان منظور

کس شان کے پیوند ہیں کیا چاک قبا ہیں
صحرا کے بگولے تری گلیوں میں گدا ہیں

سیلاب

بَن کے سیلاب آ گیا پانی
کتنے معصوم کھا گیا پانی

اَب مکاں ہیں نہ ہیں مکیں باقی
سارے نقشے مٹا گیا پانی

سارے اَرماں ڈبو کے مار دیے
کس کی باتوں میں آ گیا پانی

جینے والے بھی موت مانگیں گے
روگ ایسے لگا گیا پانی

دل سے اُٹھنے لگا یہ کیسا دھواں
میری آنکھوں میں آ گیا پانی

کیسی اَن ہونی ہو گئی ہے سحرؔ
آگ گھر گھر لگا گیا پانی

اکرم سحر فارانی

پانی

پہلے تو نگاہوں سے اوجھل ہی رہا پانی
جب آگ لگی دل میں آنکھوں سے بہا پانی

روئے تھے کنارے بھی موجیں بھی تڑپ اُٹھیں
جب آلِ محمدؐ کے پیاسوں نے کہا پانی

آلام کی بھٹی میں اَرمان سُلگ اُٹھے
کمبخت نہ کام آیا دریا میں جو تھا پانی

تقدیر میں لکھا تھا پیاسوں کا امر ہونا
دریا سے اُٹھا لاتی ورنہ یہ ہوا پانی

طُوفان کی موجوں میں کیا ناؤ پہ گزری ہے
''ساحل نے بہت پوچھا، خاموش رہا پانی''

ج سے جنگ

جنگ کی گود میں
بچے نہیں بیٹھ سکتے
ٹینکوں کے نیچے
چھپے بوڑھے
بھیانک ڈائن کی ہڈیاں
کیسے چبائیں؟
جرمِ ضعیفی
عشروں سے
ایٹمی میزائل کے نشانے پر ہے
اخبار میں
درست خبر کی اشاعت
خالص شعر جیسی ہے
اِسے صحافتی قبرستان کے کتبہ پر
لکھ آؤ
ہمیں نفسیاتی برتری کا حصار برقرار رکھنا ہے
ج سے جنگ میں
نشریاتی ادارے کے سربراہ کی
مٹھی گرم کرو
آواز دو
جنگل کے خونخوار درندوں کو
ہمارے ساتھ چلیں
یہ احتجاج کی مشین سے
مذمتی قراردادوں کا روغن نکالنے والے
سڑکوں پہ
نفرت کے ٹائر جلاتے رہیں
ہم نے
جارحیت کا جھنڈا سربلند رکھنا ہے
اور اپنے
اِس نیک مقصد سے
ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹنا
چاہے
تباہی ہمارے مظالم سے لرزنے لگے
زمین کی کہانی کا نیا رُخ سامنے آئے
انقلاب ہمارے ذہنوں پہ دستک دینے لگے

امجد بابر

تو جو جانے کی کرے بات تو یوں ہوتا ہے

ترے کہتے ہی کہ جاتا ہوں یہ محسوس ہوا
جیسے تنکا کوئی بے یار و مددگار سا ہو
دکھ کی اک لہر میں جیسے ہو سفینہ کوئی
وہ سفینہ جو کہیں برسرِ پیکار سا ہو

تو اگر سوچ بھی جانے کا تو بکھروں ایسے
جیسے سکھ نیند کا تکیہ ہی سرہانے نہ رہے
اتنے کمزور سے پڑ جائیں رگ و پے میرے
دل پھر اک لمحہ کبھی میرے ٹھکانے نہ رہے
تری پلکیں بھی جو دروازے کی جانب اُٹھیں
پل میں ہر شوق کا امکان کا خوں ہوتا ہے
میں نہیں جانتی ہر بار یہ کیوں ہوتا ہے
تو جو جانے کی کرے بات تو یوں ہوتا ہے
کیا کروں دل کا، مرے دل کی یہی خواہش ہے
یہ تمنا کہ ہمیشہ تُو مرے پاس رہے
گہری تنہائی کے آنچل پہ ستاروں کی طرح
بے کراں ذات کی وسعت کے سمندر دھارے
کوئی اترا رہے کشتی کے کناروں کی طرح
ترے کاندھوں پہ مرے سر کو سکوں ہوتا ہے
پھول تو پھول یہ کانٹے بھی بھلے لگتے ہیں
منظرِ دید میں صد رنگ فسوں ہوتا ہے

تو جو جانے کی کرے بات تو یوں ہوتا ہے
جیسے سانسوں کی گرہ کھول کے کوئی لے جائے
دل کوئی سینے کے پردے سے نکالے باہر
آنکھ کے آگے اندھیرے ہی اندھیرے چھا جائیں
ڈر کے تکیوں میں چھپانا پڑے اپنا چہرہ
سوچ کر پل میں مری آنکھ میں آنسو آ جائیں

رخشندہ نوید

نظم

سنتے تھے جس کے بارے لوگوں سے
ایک دو سے نہ سارے لوگوں سے
گاؤں اپنا بھی اب کراچی ہے
شہر اپنا بھی اب کراچی ہے
خون پانی سے بھی ہوا سستا
کوئی محفوظ اب نہیں رستا
سینہ زوری بھی، اس میں چوری بھی
عام ہے اب کے بھتہ خوری بھی
ڈاکے پڑتے ہیں دن دہاڑے اب
خون ریزی عروج پر اپنے
زوروں پر ہے فریب اور دھوکا
اب کے اغوا برائے تاواں کی
جاری و ساری وارداتیں بھی
ڈر کے مارے نہ کوئی سوتا ہے
ایک جیسے ہیں اسکے روز و شب
اب کے جینا محال ہے اس میں
بچ نکلنا کمال ہے اس میں
چین امن و سکوں نہ باقی ہے
شہر اپنا بھی اب کراچی ہے
گاؤں اپنا بھی اب کراچی ہے

عاصم بخاری

طالبِ درہم و دینار کی ایسی تیسی

طالبِ درہم و دینار کی ایسی تیسی
یعنی درباری قلم کار کی ایسی تیسی

ایک بوسیدہ کہانی کو نبھانے والے
ہر بدلتے ہوئے کردار کی ایسی تیسی

بھوک دھمال میں تھی نعرہ زنی کرتے ہوئے
شہنشاہا تری سرکار کی ایسی تیسی

اپنا شہکار کیا جس کے حوالے تو نے
کر رہا ہے ترے شہکار کی ایسی تیسی

آئے دن حسبِ ضرورت جو بدل جاتا ہو
ایسے انصاف کے معیار کی ایسی تیسی

جو وفاؤں کے معانی نہ سمجھتا ہو صغیر
اس محبت کے طلب گار کی ایسی تیسی

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تن آج جلایا ہے، کل راکھ اُڑا دیں گے
وہ نام کو دو دن میں، دشنام بنا دیں گے

نثری نظم

زندگی تمامتر بدصورت حقیقتوں
کے باوصف بھی عزیز ہے

خوابوں کی عمر نہیں ہوتی
وہ مستقل حیات کے ساتھ رہتے ہیں

گہری نیند میں خواب کھو جاتے ہیں
یاد میں نہیں آتے
ادھ جگی آنکھوں میں اترنے والے خواب
یاد رہ جاتے ہیں

سنا ہے فجر سے دکھنے والے خوابوں کی
تعبیریں سچی ہوتی ہیں
تم سے ملنے کا سمے ہی غلط تھا
جدائی مقدر ہو
تو کوئی وظیفہ کام نہیں آتا

اب
لگتا ہے برسوں سے گہری نیند میں ہوں
خواب کبھی آنکھوں میں نہیں اترے
جذبوں پر بے حسی غالب ہے اور تخئیل سونا

لیکن
زندگی اب بھی عزیز ہے
کیونکہ تمام تر تلخیوں کے باوصف
خوش رنگ لمحوں کا آہنگ سنگ رہتا ہے
زندگی اور خواب
کا طلسم ٹوٹ نہیں پاتا
زندگی اپنی تمام تر بدصورت حقیقتوں کے
باوصف بھی عزیز ہے

☆☆☆☆☆

نائیلہ راٹھور

القدس...... تیرے نام

اے مرے سجدۂ اول کی درخشندہ زمیں
بندگی آج بھی چہرے پہ ترے ٹھہری ہے
برملا آج بھی اعلان کیا کرتی ہے
ایسا قرطاس نہیں ہوں جو بدل دے تاریخ
میں تو اول ہوں، دوم ہو نہیں سکتی ہوں کبھی
اپنی پہچان کسی طور نہیں کھو سکتی

کیسے اقصیٰ کی جلالت سے نظر باغی ہو
جس کو طیبہ کے شہنشاہ نے توقیر کیا
جس میں معراج کی حیرت ہے ابھی تک باقی
اقصیٰ گلیوں میں تہہ تیغ گلابوں کی قسم
اس میں وہ بوئے مسلسل ہے ابھی تک باقی

غزہ وادی میں ہراساں گلِ توقیر! تجھے
حمزہ، مریم کے نویلے لاشے
یومِ رضوان کی سرحد پہ فروزاں کر کے
وقت برہان کو اک بار صدا پھر دیں گے

آج آوازِ اذاں قید سہی
اذن اللہ تو بہرطور سنائی دے گا
ایک صیہونی پرندے کی جنونی پرواز
روک سکتی ہے کہاں نیرِ اعظم کا جلال

قدس سے شام تلک
ارضِ فلسطین سمیت
شاخِ زیتون سے مضراب ہنر چھلکے گا
اور گائے گی کسی دف پہ رسیلی مینا
یہ مرا ذوقِ یقیں ہے جو کہیں رکتا نہیں
وقت صورت تو بدل سکتا ہے، ایمان نہیں!

فرخندہ شمیم

اُداس دن کی ایک نظم

(19 مارچ 2013 خالد احمد کی یاد میں)

زعیم رشید

تمہارے جانے کے بعد میں نے
اُداس دن میں جو آنکھ کھولی
تو لگ رہا ہے
زمین چلنے سے تھک گئی ہے
اُسے بھی لاٹھی پکڑنا ہوگی
ابھرتے سورج کی سانس اکھڑنے لگی ہے اور
چاند کی جبیں سلوٹوں سے پر ہے
چمکتے تاروں کے کالے بالوں میں چاندنی ہے
نئے الم ہیں

عجیب غم ہیں
کہ بین کرتے ہوئے دھندلکے میں
شام سب کچھ بُھلا چکی ہے
نہ صبح چہکی
نہ وصل مہکا

گھڑی کی آواز میں جو لرزش ہے عمر ڈھلنے کا عندیہ ہے
یہ مرثیہ ہے
کہ ریت گھر میں
تمہارے جانے کے بعد میں بھی
ادھیڑ سانسوں کی بازیاں
روز ہارتا ہوں

گزرتی کب ہے..... گزارتا ہوں
فقط کیلنڈر اُتارتا ہوں

تماشا گر.....!

تماشا گر.....تمھارا شکریہ لیکن
تمھارے لفظ کانوں تک تو آتے ہیں
مگر ان میں چھپی لذت کی شیرینی
ہمارے کرب کے کھاری سمندر میں
اترتے ہی
کسی بے نام حسرت کی اُچھلتی لہر کو چھو کر
ہوا کا رزق بنتی ہے
نجانے پھر کہاں جا کر برستی ہے
ہمیں ہنسنے کی خواہش ہے
مگر خواہش کا ریشم اس قدر الجھا ہوا ہے
کہ اب الجھے ہوئے ریشم کو سلجھانے کی
خواہش تک نہیں رکھتے
ہمارے مقتدر دشمن
ہمیں دیوار پر لکھا ہوا پڑھنے، سمجھنے کی
اجازت تک نہیں دیتے
وہ کہتے ہیں.....اگر جینا ضروری ہے
تو پھر خود پر ہوئے ہر ظلم پر تالی بجاؤ
مسیحا مان کر ہم کو
ہمارے گیت گاؤ
تماشا گر.....تمھارا شکریہ لیکن
ابھی ہم سن نہیں سکتے
ابھی ہم رک نہیں سکتے
ابھی رونے کا موسم ہے
ابھی ہم ہنس نہیں سکتے

خالد ندیم شانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آڑی ترچھی، اُلٹی سیدھی کھینچ کے چند لکیریں
اُلجھ رہا ہُوں دیکھ کے اپنی سوچوں کی تصویریں

''الذی خلق الموت والحیوۃ''

زاہد خان

کون بے خیالی میں انگلیوں کے پوروں پر

گن رہا ہے دن اپنے

کون ہے جو خوابوں کی

ان گنت شبیہوں کو

زندہ کرتا جاتا ہے

تم نے آج تک کوئی ایسا دن گزارا ہے

جس میں اپنے ہونے کا شائبہ نہیں ہوتا

مجھ سے پوچھنے پر بھی

میں نہیں بتا سکتا

اس خدا کے بارے میں

جس نے زندگی کے ساتھ

موت کو بنایا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پریشاں رو ، کسی پہلو نہیں تھا
ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا

گمشدہ

وہ قوس وقزاح کے رنگوں جیسی۔۔
تتلی کے نازک پنکھوں جیسی۔۔
بہتے ہوئے جھرنوں جیسی

زندہ دل تازہ گلاب سی لڑکی
سب کی آنکھوں کا خواب سی لڑکی
ہنستا چہرہ مہتاب سی لڑکی

ہنستی تو جیسے
دکھوں کو چڑا رہی ہو
اپنی رعنائیوں پہ اترا رہی ہو

اپنی طرف آتے دکھ کو
جوتے کی نوک پر رکھتی تھی
اندھیرے ڈرانے آتے تو
انگلی پکڑ کے انکو
باہر کا رستہ بتاتی تھی

اب کہ یہ کیسا موسم آیا ہے؟

کھنکتے لہجے پر برف پڑی ہے
ہنستے چہرے پہ
اداسی کا کہر جما ہے
اندھیرا دل میں گھر کر گیا ہے
کالی شامیں آنگن میں
مکڑی کی طرح جالے بُن گئی ہیں
منڈیروں پر خزاں کا قبضہ ہے
آہیں دھمال مچائے
وحشتیں،
ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
اس کے اردگرد۔۔۔!!
کِکلی کھیل رہی ہیں۔

فرح شاہد

فلسطین اکتوبر 2023

اے دنیا کے مسلمانو
تم کب جاگو گے
سرزمین فلسطین سے
یہود و نصارا نے
تمھیں للکارا ہے
کہ بیت المقدس
تو.....ہمارا ہے
ذرا.....سوچو
اے دنیا کے مسلمانو
آج
طاغوتی قوتوں نے
جو بنائے جال
اور.....اسرائیل نے
کر دیا ہے جو حال
امریکہ نے بھی
جو دیا ہے مال
اور
یہ ب ظالم ملکر
سرزمین فلسطین کے
وہ ننھے ننھے پھول
اور.....خوبصورت کلیاں
اور.....حق پہ لڑنے نوجوان
چیخ و پکار کرتی ہوئیں
بہن بیٹیاں اور مائیں
اور.....روتے ہوئے مرد
سرزمین فلسطین کا
ذرہ ذرہ یہ پکار رہا ہے
اے دنیا کے مسلمانو
تم کب آؤ گے تم تب آؤ گے
جب دشمن اسلام
ہمیں ابدی نیند
سلا دے گا
اے دنیا کے مسلمانو
تم سوچ لو
یہ بیت المقدس تمھیں
معاف نہیں کرے گا
اور
تم پچھتاؤ گے
تم کب آؤ گے
تم کب ہمارے کندھے سے کندھا
ملاؤ گے
اور.....اسرائیل کے
ناپاک عزائم کے سامنے
ڈٹ جاؤ گے.....

احسان فیصل کنجاہی

موسمِ بہار کا ایک گیت

(ایک افریقین نظم ''A song in spring'' کا منظوم ترجمہ)

ایک لڑکا روشنی کے دائروں میں رقص کرتا ہے،
خود اپنی روشنی کے دائروں میں۔۔
دور سے آتی صداؤں پر
وہ جب بھی رقص کرتا ہے
تو اس کے پاؤں پھولوں کی طرح کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔۔
وہ رقص کرتا ہے
تو سورج سے بھی اوپر جا پہنچتا ہے۔۔
وہ سورج کو ہتھیلی پر اٹھا کر
اپنی میلی انگلیوں سے کچھ مسلتا ہے تو اس کی انگلیاں کھلتی دکھائی دیتی ہیں۔۔۔
سورج،
جسے وہ رقص کے دوران ہاتھوں میں پکڑ کر گھومتا ہے،
وہ کوئی سورج نہیں، اک پھول ہے۔۔۔۔
وہ رقص کرتا ہے
خود اپنی روشنی کے دائروں میں۔۔۔
وہ خود سورج ہے،
وہ خود روشنی ہے۔۔۔

مہر علی

نظم

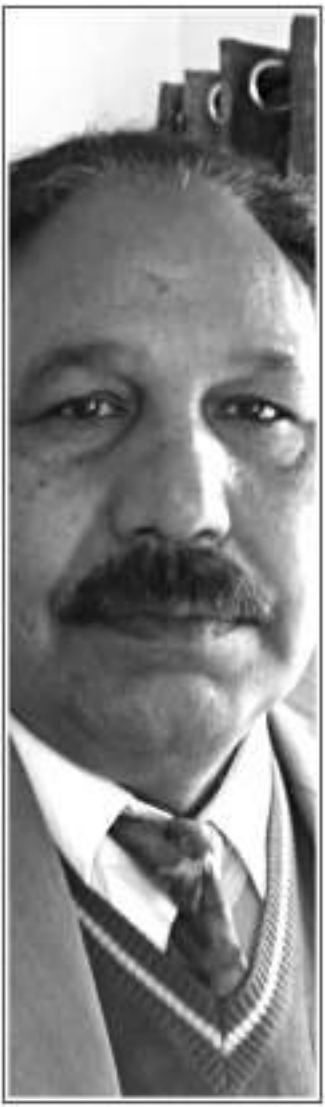

میتھیو محسن

یہ آزادی
محسوس نہیں ہوتی
ہونٹوں پہ رک جائے
جب کوئی بات آتی، آتی

یہ وادی
خوف کی وادی
کوئی غدار نہ کہہ دے
حب الوطنی پہ سوال نہ اٹھا دے

یہ آبادی
نامعلوم افراد کی
شہر میں جو رہتے ہیں
جنگل تو اب رہا نہیں باقی

ننھی شہزادی
ہوس کی بھینٹ چڑھی ہے
انصاف کی دیوی پاس کھڑی ہے

یہ سنگین سیاہی
پنکھ پھیلائے
ذہنوں کی کھڑکی بند کرے
رات کو دن جھوٹ کو سچ کہے

برسات کی رُت ہے

گلشن میں چلے آؤ یہ برسات کی رت ہے
آ جاؤ جی آ جاؤ یہ برسات کی رت ہے

اٹھ جاؤ کہ ہیں دید کے لائق یہ مناظر
سو کر نہ گنواؤ یہ برسات کی رت ہے

بھیگی سی کلی کوئی ذرا چن کے چمن سے
زلفوں میں سجا لاؤ یہ برسات کی رت ہے

ہجراں میں تو لگتے ہیں سبھی ایک سے موسم
مکھڑا دکھا جاؤ یہ برسات کی رت ہے

مل کے جو بیٹھیں گے بہل جائے گا دل بھی
تنہا نہ یوں اکتاؤ یہ برسات کی رت ہے

آ جاؤ کہ ہم بانٹ لیں دکھ درد نہ یوں اشک
آنکھوں سے بہاؤ یہ برسات کی رت ہے

دھرتی ہوئی سیراب یوں کھل کر ہوئی برسات
اکھیوں کو نہ ترساؤ یہ برسات کی رت ہے

بلبل کی طرح بیٹھا ہے مظہر بھی اکیلا
گل بن کے چلے آؤ یہ برسات کی رت ہے

ضیا المظہری

نظم

محمد امین کنجاہی

ترا ساتھ بھی ہو برسات بھی ہو
دل ملنے کی کوئی بات بھی ہو
جب عشق بساط بچھائیں ہم
پھر جیت بھی ہو اور مات بھی ہو
دو جسم رہیں اک ذات بھی ہو
درخواست ہے مری تم سے اب
اک عمر ہوئی تنہا رہتے
گر سانس کی ڈوری ___ ٹوٹ گئی
پھر آس کا بندھن ٹوٹے گا
پھر آنکھوں سے سیلاب نہیں
زخموں کا چشمہ پھوٹے گا
ابھی وقت ہے جاں ___ محسوس کرو
تم ساتھی ہو تم دلبر ہو
احساس کرو
مرے ساتھ چلو
مرا دکھ بانٹو
اقرار کرو
نہ دل توڑو
مرے ساتھ چلو ___ احساس کرو

کرونا دندنا رہا ہے

در توبہ ابھی بند نہیں ہوا
خامشی کا راج ہے
سناٹا ہے کہ چھایا ہے
بام و در پر
کوچہ و بازار، شہر در شہر
ملک در ملک، براعظم تا براعظم
بازار بند، پلازے بند
جوا خانے بند، سینما بند
کلب بند، میخانے بند
صرف کھلے ہیں تو
ہسپتال اور شفا خانے
مردہ خانے، قبرستان
ایسا بھیانک منظر
کب چشم فلک نے دیکھا
اپنی حیاتی میں جنگیں دیکھیں
زلزلے، سیلاب، عذاب
مگر کبھی یہاں کبھی وہاں
کبھی مشرق، کبھی مغرب
مگر یہ عجب بلا ہے
کہ وبا ہے

پوری دنیا پر اس کی حکمرانی
سب اس کے آگے سرنگوں
بے بس، لاچار، مجبور
کرونا--- کرونا دندنا رہا ہے
موت کا رقص جاری و ساری
سائنس اس کے سامنے بیدست و پا، مجبور لاچار
سائنس کا کیا عروج و کمال تھا
کلوننگ کے ذریعے انسان بننے کے مراحل تھے
مصنوعی چاول اور انڈے تھے
امریکہ طاقت کے نشے میں بدمست
سائنسی ترقی کی اس معراج پر
انسان خود کو خدا سمجھتا تھا، نشے میں بدمست،
انسانی اقدار کو قدموں تلے روندتا ہوا
پیسہ، ڈالر سب سے بڑا خدا
پوری دنیا اس کے پیچھے سرگرداں
خالق سے روگرداں
ماضی کے خداؤں کی طرح
قارون، فرعون، نمرود
نمرود کا خاتمہ ایک ادنیٰ مچھر سے
اور آج سائنس کو شکست فاش

ایک وائرس سے
بیشک اللہ ہر چیز پر قادر
کرونا، کرونا دنیا کے ہر حصے میں
کرونا--- کرونا یہاں--- وہاں لہراتا ہوا
گویا کہہ رہا ہو کرونا
کرونا اور کرونا نافرمانی
کرونا بے حیائی کے کام
کرونا آپس میں شادی کے قانون پاس
کیا قومِ لوط کا انجام بھول گئے
کیا قومِ عاد و ثمود کا حال نہیں پڑھا
مگر تم ان سب سے بڑھ کر طاقت کے نشے میں دھت
عراق، شام، فلسطین، کشمیر
کیسا موت کا بازار گرم کیے رکھا
بھول گئے کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے
اللہ جب چاہے رسی کھینچ لے
پوری دنیا اس وائرس کے ہاتھوں عضوِ معطل
مسلمان بھی اس کی زد میں
کیوں؟ کیوں؟
عمل سے حسنِ عمل سے دور
پیروکارِ یہود و ہنود
ابھی بھی وقت ہے کہ در توبہ بند نہیں
مقامِ شکر و بندگی کہ
قومِ لوط کی طرح زمین
نہیں پلٹ گئی
اب بھی در توبہ کھلا ہے
آؤ اپنے اصل کی طرف لوٹ چلیں
کرونا کرونا اللہ کے دیئے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرونا
اچھے کام کرونا
اچھے عمل کرونا
قرآن پر عمل کرونا
سچے دل سے توبہ کرونا
اپنے خالق و مالک کو راضی کرونا

نصرت نسیم

نظم

وہ ایک لڑکی
جو اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو نوچتی ہے
کبھی mirror میں جو خود کو دیکھے، تو چیختی ہے
وہ کپکپی جو ہے اس پہ طاری
وہ اس سے پیالی کو اپنے اوپر اُنڈیلتی ہے
وہ سب کو سکتے میں گھورتی ہے،
جو شب میں خوابوں سے خوف کھا کر
پلنگ پہ بیٹھے پلنگ پہ لیٹے وہ اپنے تکیے دبوچتی ہے
وہ اسی revulsion میں جاگتی ہے

وہی کہیں پہ وہ ایک بچہ
جو اپنے ابو اور اپنی امی کا لاڈلا ہے
جو اپنے گھر میں شرارتوں کا
tornado تھا سمجھا جاتا
وہ اب جو چُپ ہے تو اپنی امی اور اپنے ابو کے
اب کلیجے کو کاٹتا ہے، کہ کیوں وہ چپ ہے؟

اسی طرح کے ہزار قصے
ہزار بستر، ہزار خوشیوں کا مرگِ انبوہ
کہیں پہ بوڑھے جو اس ضعیفی میں اپنے
بچپن میں کھو گئے ہیں
کہیں پہ بچے جو ہنستے ہنستے کسی شرارت سے ڈر گئے ہیں
کہیں پہ لڑکے جو ذہنی عارض سے نوجوانی
کے اس زماں میں، hallucination
سے لڑ رہے ہیں.....
اس طرح سے وہ دیویوں سی حسین لڑکی
حسیں بدن کو ہے عیب کہتی، حسیں سخن کو ہے روگ کہتی
ہے رفتگاں کے عذاب سہتی!

یہ Asthma کے مریض بن کر جو جی رہے ہیں
یہ سانس لینے کی اک اذیت سے لڑ رہے ہیں.....
یہ اپنے اندر کے مردہ خانوں کے اک
تعفن سے بھر گئے ہیں

☆☆☆☆☆

اُسامہ احمد

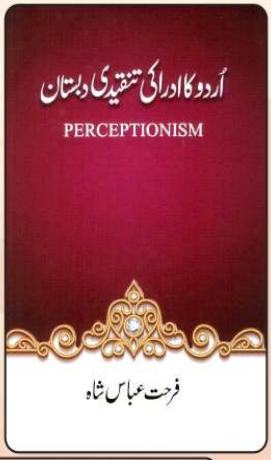

اُردو کا ادراکی تنقیدی دبستان
PERCEPTIONISM
فرحت عباس شاہ

شوکت محمود شوکت

BOOK HOME
پابلو نرودا کی شاعری
بشیر احمد شاد

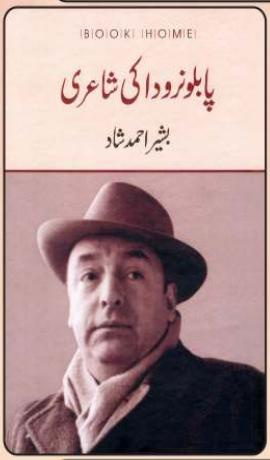

ردِّعمل
اکمل حنیف

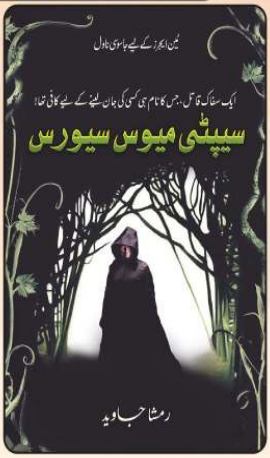

ٹین ایجرز کے لیے جاسوسی ناول
ایک سفاک قاتل، جس کا نام ہی کسی کی جان لینے کے لیے کافی تھا!
سیپٹی میوس سیورس
رمشا جاوید

ਹੀਰ ਫ਼ਰਹਤ ਸ਼ਾਹ
ہیر فرحت شاہ
فرحت عباس شاہ

جناب ریاض حسین زیدی، جناب پرویز مشرف سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

جناب ریاض حسین زیدی، جناب شہباز شریف سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

جناب ریاض حسین زیدی، جناب علی اصغر عباس، جناب باقی احمد پوری، جناب نجیب احمد